Registered No. L. 4186

جمادی الاول ۱۳۶۶ھ

جلد ۳۰

عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دار الاسلام - جمال پور - پٹھانکوٹ

فہرست مضامین

۱۹۴۷

جلد ۳۰ | جمادی الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق اپریل ۱۹۴۷ء | عدد ۵

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس نمبر لین روڈ لاہور میں چھپوا کر دارالاسلام، پٹھانکوٹ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

بعض لوگوں کو ہم سے یہ شکایت ہے کہ ان صفحات میں ہم نے ملک کے فسادات پر جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ تر مسلمانوں ہی کو ملامت کرنے کی کوشش کی ہے، کبھی غیر مسلموں کو ان کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں پر ملامت نہیں کی۔ یہ شکایت، جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے، ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس کی وجہ خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ ہم کو مسلمانوں سے کوئی اللہ واسطے کا بغض ہے کہ وہ ملامت کے مستحق ہوں یا نہ ہوں لیکن ہم ان کو ملامت کریں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان ایک سچی شریعت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں جو ایک جامع اور مکمل شریعت ہے۔ یہ شریعت ان کو دوستی اور دشمنی، نفرت اور محبت، عفو اور انتقام، صلح اور جنگ کا ایک پورا ضابطہ دیتی ہے اور ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی وہ اسی ضابطہ پر عمل کریں اور اس سے سر مو انحراف نہ کریں۔ اس ضابطہ پر عمل کرنا ان کے لیے صرف اسی وجہ سے ضروری نہیں ہے کہ وہ اس پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ دشمنی اور دوستی اور صلح و جنگ کے ان اعلیٰ اور برتر قوانین کی تعلیم دنیا کو انہی کے قول و عمل سے ملنی ہے اس وجہ سے یہ اگر ان سے ذرا بھی انحراف اختیار کریں تو یہ صرف ہماری ہی ملامت کے مستحق نہیں ہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول اور اس کے فرشتوں اور تمام خلق کی طرف سے ملامت اور سرزنش کے سزاوار ہیں اور ہم نہایت بدخواہ ہوں گے اگر ان کی کسی اس طرح کی غلطی پر ان سے چشم پوشی کر جائیں، یا ملامت کرنے کے بجائے، حمیت جاہلیت کے جوش میں، الٹے اس کی تعریف شروع کر دیں یا کم از کم اس کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہم اپنے آپ کو بھی خدا کے

غضب کا مستحق بنائیں گے اور اپنی قوم کو بھی خدا کے غضب کی طرف دھکیلیں گے۔

دوسرے اگر اصلاح کی جگہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں تو اس پر تعجب نہیں ہے کیونکہ ان کو صلاح اور فساد کا فرق ہی نہیں معلوم ہے بلکہ جو کام ان کی دانست میں صلاح کے ہیں وہ بھی، اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھے جائیں تو بیشتر فساد ہی کے نکلیں گے، تعجب اور افسوس تو ان لوگوں پر ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے صلاح و فساد کی حقیقت سے آگاہ بھی کیا ہے اور ان کو اس کام پر مامور بھی کیا ہے کہ وہ زمین کو فساد سے پاک کریں لیکن ان کے ہاتھوں سے صلاح کے بجائے فساد کے کام ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اگر نواکھالی کے شریروں کی شرارت کا بدلہ بہار کے بے گناہ مسلمانوں سے لیتے ہیں تو اس پر ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی کیونکہ ممکن ہے ان کے پاس صلح و جنگ کا کوئی ایسا آئین ہی نہ ہو جو ان کے اس طرزِ عمل کو غلط اور ظالمانہ ٹھیراتا ہو لیکن مسلمانوں کے لیے اس طرزِ عمل کی تقلید ناجائز ہے کیونکہ ان کے پاس اللہ کی کھلی ہوئی کتاب ہے جس میں اس طرزِ انتقام کو صریحاً ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے اگر بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو قتل کرتے ہیں، عورتوں کو بے حرمت کرتے ہیں، لوگوں کو زبردستی ان کے دین سے پھیرتے ہیں، بستیوں کو آگ لگاتے ہیں، کھیتوں کو جلاتے ہیں تو اس پر ان کو سرزنش نہیں کی جا سکتی کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اپنے مخالفوں کے ساتھ یہ ساری باتیں کرنا وہ جائز سمجھتے ہوں۔ لیکن مسلمانوں کو پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم دی ہے اس کی رو سے وہ اپنے کسی سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی ان باتوں میں سے ایک بات بھی کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ دوسرے اگر پناہ دینے کا عہد کر کے غداری کر جائیں اور جن کو پناہ دیں ان کو قتل کر دیں تو اس پر بھی ذرا حیرت ہے اور نہ افسوس کیونکہ ان کو خبر ہی نہیں کہ عہد کیا بلا ہے اور عہد کی ذمہ داری کس چیز کو کہتے ہیں، البتہ اگر یہی حرکت مسلمان کہیں کر دیں تو ان کے لیے یہ بڑے شرم و ذلت کی بات ہے کیونکہ دنیا کو پابندی عہد کی جو تعلیم انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے ملی ہے اس کے حامل یہی ہیں —— یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے جب مسلمانوں سے متعلق ہمارے علم میں کوئی ایسی بات آتی ہے جو صریحاً اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ہوتی ہے تو دل کو بڑا صدمہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر دنیا کو عمل

کرانے کے لیے بھیجے گئے ہیں وہی لوگ جب ان کی خلاف ورزی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو اب دنیا میں حق کس کے ذریعہ سے پھیلے گا اور سچائی اور انصاف کی تعلیم دینے کے لیے کون لوگ آئیں گے۔

اللہ کی شریعت سے خود اس کے حاملین کی یہ بغاوت بجائے خود اتنا بڑا جرم ہے کہ جس سے بڑا جرم کوئی اور ہو نہیں سکتا لیکن مسلمان صرف اسی پر قانع نہیں ہیں کہ اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کریں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کی ان غلطیوں پر نہ صرف یہ کہ ان کو ٹوکا نہ جائے بلکہ ان کی تعریف کی جائے۔ اور بعض حضرات تو یہاں تک کہہ گذرتے ہیں کہ خدا اور رسول اور ان کے احکام سب برحق سہی لیکن آج ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔ ان کے خیال میں آج جو کچھ مسلمان کر رہے ہیں ملت کا مفاد اسی میں ہے، اور اگر اللہ اور رسول نے کوئی بات اس کے خلاف کہی ہے تو نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ کو بھی اس کا پتہ نہیں ہے کہ آج ملت کا مفاد کس چیز میں ہے۔ یہ ساری باتیں قومی نقطۂ نظر کے استیلاء کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان اب اپنے سارے معاملات پر بالکل اس طرح غور کرنے لگے ہیں جس طرح نسلی اور جغرافی اصولوں پر بنی ہوئی قومیں غور کیا کرتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے استیلاء کے بعد یہ مجبور ہیں کہ خدا کی کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے اپنی حریف قوموں سے رہنمائی حاصل کریں اور ان کی چالوں کو دیکھ کر اپنے ارادوں اور منصوبوں کا نقشہ تیار کریں۔ ان حالات میں ان کے لیے یہ بات بھی کچھ بالکل قدرتی سی ہے کہ وہ ان لوگوں پر غضبناک ہوں جو ان کے ہر جائز و ناجائز فعل کی تحسین کرنے کے بجائے ان کو ٹوکنے اور اپنے خیال کے مطابق راہ راست پر لانے کی کوشش کریں لیکن ہم کو یہی تلخ فرض انجام دینا ہے اس وجہ سے ہم وہی کہیں گے جو ہمارے نزدیک حق ہے خواہ مسلمان ان باتوں کو قبول کریں یا نہ کریں۔

سب سے پہلی چیز جس کی طرف ہم مسلمانوں کو توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انھیں موجودہ حالات میں از روئے شرع صرف اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر کوئی جماعت ان پر حملہ آور ہو تو وہ مدافعت کریں اور اس مدافعت میں جو قوت و طاقت ان کو میسر ہو اس کو استعمال کریں۔ لیکن ان کو اس بات کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی جگہ بھی جارحانہ پوزیشن اختیار کریں اور ان لوگوں پر حملہ کریں جنھوں نے ان پر حملہ نہ کیا ہو۔ اگر وہ ایسا کریں گے

تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہو گا جس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ کسی جگہ کے شریر لوگوں کی شرارت کا بدلہ اس قوم کے دوسری جگہ کے لوگوں سے لینا اور ان پر حملہ کرنا اگر جائز ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے جبکہ اس قوم سے من حیث القوم ہماری جنگ چھڑ چکی ہو۔ اس صورت کے علاوہ اور کسی صورت میں بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ ہم کسی قوم کے تمام افراد کو دشمن سمجھیں اور ان کے ساتھ دشمنوں کا سا معاملہ کریں۔ جب تک کوئی قوم من حیث القوم ہمارے خلاف اعلان جنگ نہ کر دے یا ہم اس کے خلاف من حیث القوم اعلان جنگ نہ کر دیں اس وقت تک اس کے صرف وہی افراد ہمارے دشمن ہیں جو ہمارے ساتھ دشمنی کریں۔ ان کے علاوہ بقیہ لوگوں کے ساتھ، جنھوں نے ہمارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے، ہمارے معاملات بالکل دوستانہ ہوں گے اور ہم کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم ان کے جان و مال کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ رہی یہ بات کہ کسی قوم کے خلاف جارحانہ جنگ کا اعلان کرنے کا حق ہم کو کب حاصل ہے تو اس کے شرائط پر ہم پوری تفصیل کے ساتھ اس رسالہ کی کسی پچھلی اشاعت میں بحث کر چکے ہیں۔ جو لوگ فی الواقع اس مسئلہ کو سمجھنا چاہتے ہوں وہ اس مضمون کو ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ ان شرائط کو پورا کیے بغیر جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ انھیں تلوار اٹھانے کا حق حاصل ہے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے طرز عمل سے اسلام کو بھی بدنام کر رہے ہیں اور اپنی عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں۔

دوسری اہم حقیقت مسلمانوں کے سامنے ہم یہ لانا چاہتے ہیں کہ مدافعت میں بھی ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان حدود سے آگے نہ بڑھیں جو شریعت نے ان کے لیے قائم کر دیے ہیں۔ جو لوگ آپ پر زیادتی کریں ان کو پوری قوت سے جواب دیجیے اور آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کی زیادتی کا بدلہ ان سے پورا لیجیے لیکن جو باتیں اسلام کے اصول جنگ میں اصولاً ممنوع ہیں اگر دشمن ان کا مرتکب بھی ہو جب بھی آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ ان باتوں میں سے کسی ایک بات کا ارتکاب کریں۔ مثلاً بچوں کو قتل کرنا، عورتوں کو بے حرمت کرنا، بوڑھوں کو قتل کرنا، عہد کر کے غداری کرنا، مکانوں اور کھیتوں کو جلانا،

دین کے معاملہ میں جبر کرنا اسلام میں جائز نہیں ہے اور کسی گرے سے گرے دشمن کے ساتھ بھی آپ کو اس نے ان باتوں میں سے کوئی بات کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ یہاں تک کہ اگر دشمن نے آپ کے ساتھ یہ ساری زیادتیاں کی بھی ہوں اور آپ ان کی وجہ سے نہایت اشتعال میں ہوں اور اسی اشتعال کی حالت میں اللہ تعالیٰ آپ کو اس پر غلبہ دیدے جب بھی آپ کے کسی سپاہی کے لیے یہ بات جائز نہ ہوگی کہ وہ کسی بچہ، عورت اور ضعیف پر ہاتھ اٹھائے اور اگر وہ ہاتھ اٹھائے گا تو اسلامی قانون کی رو سے خود آپ ہی کی عدالت اس کو قتل نفس اور ہتک حرمت کی سزا دے گی خواہ دشمن کی طرف سے کوئی استغاثہ نہ کیا جائے۔ اسلام نے جو بین الاقوامی قوانین بنائے ہیں ان کی پابندی مسلمانوں کے لیے بہر حال واجب ہے، اور اسی طرح واجب ہے جس طرح شریعت کے دوسرے تمام احکام کی پابندی واجب ہے۔ ان احکام کی پابندی پر کوئی اثر دشمن کے رویہ کی وجہ سے نہیں پڑتا۔ اگر آپ کا مقابلہ کسی ایسی قوم سے ہو جن کے ہاں بچوں کا قتل کرنا اور عورتوں کو بے حرمت کرنا جائز سمجھا جاتا ہو جب بھی آپ کے لیے ان ساری باتوں کی حرمت علی حالہ قائم رہے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ چونکہ آپ کا حریف ان باتوں کو جائز سمجھتا ہے اس وجہ سے آپ کے لیے بھی یہ ساری باتیں جائز کر دی جائیں۔

آج اسلام کے احکام مسلمانوں کے قومی جذبات پر کتنے ہی گراں کیوں نہ گذرتے ہوں لیکن ان کے لیے خیر و برکت اسی میں ہے کہ ان احکام کی پوری پابندی کریں۔ اگرچہ بسا اوقات ان باتوں پر عمل کرنا قومی مصالح کے بالکل خلاف نظر آئے گا، بعض اوقات جذبات کی رو میں یہ احکام خود مسلمانوں کے لیے اہانت انگیز معلوم ہوں گے، بعض حالات میں ایسا نظر آئے گا کہ اگر ٹھیک ٹھیک ان اصولوں کی پیروی کی جائے جو اسلام نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ صرف کھلی ہوئی شکست ہے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود ان کے ایمان و اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اللہ کے احکام سے انحراف نہ اختیار کریں۔ اگر موجودہ ہیجان انگیز حالات میں مسلمان اپنے مخالفوں کی ہر طرح کی زیادتیوں کے باوجود حق پر قائم رہے اور ان کی طرف سے کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس کی اسلام میں ممانعت ہے تو انشاء اللہ اس کے نتائج نہایت اچھے نکلیں گے اور ان

بہت سی کوتاہیوں کی تلافی ہو جائے گی جواب تک انھوں نے اسلامی اصولوں کا مظاہرہ کرنے میں کی ہیں
ان ہنگامہ خیز حالات کا اگر کوئی پہلو اچھا ہے تو بس یہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک نادر موقع اس بات کے لیے
مل رہا ہے کہ وہ دنیا کو دکھا سکتے ہیں کہ اسلام نے ان کو اپنے دشمنوں کے ساتھ کس اخلاق کا حکم دیا ہے۔ وہ
کس طرح انتہائی اشتعال انگیز حالات میں بھی اپنا توازن قائم رکھتے ہیں، کس طرح انتہائی زیادتیاں کرنیوالوں کے
ساتھ بھی معاملہ کرنے میں عدل و انصاف کی پوری رعایت کرتے ہیں، کس طرح اپنے دشمنوں کی عزت و ناموس
کی بھی حفاظت کرتے ہیں، کس طرح عہد کر کے پوری وفاداری کے ساتھ اس کو نباہتے ہیں، کس سچائی اور دیانت
کے ساتھ معاہدہ صلح کی نگرانی کرتے ہیں اور پھر کس بہادری اور ہمت کے ساتھ اعلان جنگ کا خیر مقدم
کرتے ہیں ——— ان ساری باتوں میں دنیا کا اخلاق درجہ کمینہ اور رذیل ہو گیا ہے بالخصوص یورپ
نے اپنی پچھلی جنگ میں جس اخلاق کا مظاہرہ کیا ہے اس سے تو دنیا کو صرف یہ سبق ملا ہے کہ جنگ کو
انسانی اخلاق سے سرے سے کوئی علاقہ ہی نہیں ہے۔ اگر ان بگڑے ہوئے حالات کے اندر مسلمانوں
نے بھی اپنی ذمہ داری فراموش کر دی اور دنیا کے سامنے کوئی اچھی مثال نہ پیش کی تو یہ دنیا کس طرح
باور کر سکتی ہے کہ آدمی صلح کی طرح جنگ کے حقوق بھی فرشتوں کی سی پاکیزگی اور شرافت کے ساتھ
ادا کر سکتا ہے۔

تعداد اور سروسامان کی انتہائی کمی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے دشمنوں پر غلبہ دیا ہے
اور تاریخ میں کوئی ایک دو مثالیں اس کی موجود نہیں ہیں بلکہ ایسی فتحمندیوں کا ایک پورا سلسلہ ہے جس سے
مسلمان واقف ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ آخر وہ خود غور کریں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے تعداد اور سروسامان
دونوں چیزوں کی کمی کے باوجود ان کے دشمنوں پر ان کو غالب اور فتحمند کیا اور صرف عرب کے غیر متمدن اور وحشی
دشمنوں ہی پر نہیں بلکہ ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں پر غالب کیا اور مصر اور ہندوستان جیسے ملکوں
کو ان کے زیرنگیں کر دیا؟ اگر وہ صحیح طریق پر غور کریں گے اور اپنے موجودہ قومی جذبات کی رو میں نہیں بہہ جائیں گے
تو اس سوال کا ایک ہی جواب ان کو ملے گا اور وہ یہ کہ اس وقت ان کے پاس دنیا کے لیے ایک پیغام تھا

جس کی دلکشی کا یہ حال تھا کہ ہر شخص کا دل اس کی طرف آپ سے آپ کھنچتا تھا اور اس پیغام کی حامل ایک جماعت تھی جو اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کچھ ایسی بڑی نہیں تھی لیکن اپنی سیرت کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ تھی۔ بس یہ پیغام اور یہ سیرت دو چیزیں تھیں جن کی وجہ سے بڑی بڑی جماعتوں کے مقابل میں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو غالب کیا یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے اس کرۂ ارضی کے ہر حصہ میں یہ پیغام بھی پہنچ گیا اور یہ جماعت بھی فتحمندانہ داخل ہو گئی اور کوئی طاقت خواہ وہ کتنی ہی مادی سر و سامان سے مسلح ہو کر اٹھی اس جماعت کی راہ نہ روک سکی۔

آج بھی اگر مسلمان اس دنیا میں عزت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخ روئی چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ ایک ہی ہے کہ اس پیغام کو لے کر اٹھیں جسے لے کر وہ اس دنیا میں آئے تھے۔ اور اپنی سیرت اس طرح کی بنائیں جیسی کہ اس پیغام کے حاملین کی ہونی چاہیے۔ وہ دفعتہً محسوس کرنے لگیں گے کہ ان کی قوت دس گنی بڑھ گئی ہے۔ آج جو مزاحمتیں ان کی راہ میں ہیں وہ آہستہ آہستہ سب دور ہو جائیں گی۔ ان سارے خطرات کا آپ سے آپ علاج ہو جائے گا جن کو دفع کرنے کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا تدبیریں کر رہے ہیں لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی ہے۔ ان کے اندر نفوذ کرنے کی ایسی قوت پیدا ہو جائے گی کہ ان کو کسی سے لڑنے کی ضرورت نہ ہو گی، دوسرے ان سے خود ڈریں گے۔ ان کے اندر ایسی کشش اور محبوبیت پیدا ہو جائے گی کہ جو لوگ ان سے نفرت کرنا چاہیں گے وہ بھی ان کا احترام کریں گے، اور جو لوگ ان کو گالیاں دینا چاہیں گے ان کے دل بھی ان کی عظمت سے لبریز ہوں گے۔ وہ ہر مذہب و ملت والوں کے نزدیک بہترین پڑوسی سمجھے جائیں گے، بہترین شریک کار خیال کیے جائیں گے اور بہترین ساتھی گنے جائیں گے۔ لوگ اپنوں سے بدگمان ہوں گے اور ان پر اعتماد کریں گے۔ اپنے ہم مذہبوں کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کے پاس اپنی امانتیں رکھوائیں گے۔ ان کے پڑوس میں اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کو اس سے زیادہ محفوظ خیال کریں گے جتنا کہ وہ اپنے سگے بھائیوں کے پڑوس میں سمجھ سکتے ہیں۔ لوگ ان کے ساتھ کاروبار کرنے میں، ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں، ان کے ساتھ دوستی کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے اور جو کامیاب ہو جائے گا وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھے گا۔

تفہیم القرآن

(۱۲)

یوسف

(از رکوع ۱۱ تا ختم سورہ)

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں،[۱] تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں"۔ گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں"۔[۲]

---

[۱] اس سے انبیاء علیہم السلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسف کا قمیص لے کر مصر سے چلا ہے اور ادھر سینکڑوں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوب اس کی مہک پا لیتے ہیں۔ مگر اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ قوتیں کچھ ان کی ذاتی نہ تھیں بلکہ اللہ کی بخشش سے ان کو ملی تھیں اور اللہ جب اور جس قدر چاہتا تھا انھیں کام کرنے کا موقع دیتا تھا۔ حضرت یوسف برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوب کو ان کی خوشبو نہ آئی، مگر اب یکایک قوت ادراک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی ان کا قمیص مصر سے چلا ہے اور وہاں ان کی مہک آنی شروع ہو گئی۔

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک طرف قرآن حضرت یعقوب کو اس پیغمبرانہ شان کے ساتھ پیش کر رہا ہے اور دوسری طرف بنی اسرائیل ان کو ایسے رنگ میں دکھاتے ہیں جیسا عرب کا ہر معمولی بدو ہو سکتا ہے۔ توراۃ کا بیان ہے کہ جب بیٹوں نے آکر خبر دی کہ "یوسف اب تک جیتا ہے اور وہی سارے ملک مصر کا حاکم ہے تو یعقوب کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اس نے ان کا یقین نہ کیا......اور جب ان کے باپ یعقوب نے وہ گاڑیاں دیکھ لیں جو یوسف نے ان کو لانے کے لیے بھیجی تھیں تب اس کی جان میں جان آئی"۔

[۲] یہ معلوم ہوتا ہے کہ پورے خاندان میں حضرت یوسف کے سوا کوئی اپنے باپ کا قدر شناس نہ تھا اور

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۸۰ پر)

پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسف کا قمیص یعقوب کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" سب بول اٹھے "ابا جان! آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کریں، واقعی ہم خطاکار تھے۔" اس نے کہا "میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔"

پھر جب لوگ یوسف کے پاس پہنچے[51] تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھا لیا[52] اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا "چلو، اب شہر میں چلو، اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے۔"

(شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر (اپنے پاس) تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔[53] یوسف نے کہا "ابا جان! یہ تعبیر ہے میرے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹) حضرت یعقوب خود بھی ان لوگوں کی ذہنی و اخلاقی پستی سے نابرس تھے۔ گھر کے چراغ کی روشنی باہر پھیل رہی تھی، مگر خود گھر والے اندھیرے میں تھے اور ان کی نگاہ میں وہ ایک ٹھیکرے سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ فطرت کی اس ستم ظریفی سے تاریخ کی اکثر و بیشتر بڑی شخصیتوں کو سابقہ پیش آیا ہے۔

(حواشی صفحہ ہذا) [51] توراۃ کا بیان ہے کہ سب افرادِ خاندان جو اس موقع پر مصر گئے ۶۷ تھے۔ اس تعداد میں دوسرے گھرانوں کی ان لڑکیوں کو شمار نہیں کیا گیا ہے جو حضرت یعقوب کے ہاں بیاہی ہوئی آئی تھیں۔ اس وقت حضرت یعقوب کی عمر ۱۳۰ سال تھی اور اس کے بعد وہ مصر میں ۱۷ سال زندہ رہے۔

[52] تلمود میں لکھا ہے کہ حضرت یعقوب کی آمد کی خبر پہنچی تو حضرت یوسف سلطنت کے بڑے بڑے امرا و اہلِ مناصب اور فوج فرا کو لے کر ان کے استقبال کے لیے نکلے، اور پورے تزک و احتشام کے ساتھ ان کو دار السلطنت میں لائے۔ وہ دن شہر میں جشن کا دن تھا۔ عورت، مرد، بچے سب اس جلوس کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

[53] اس لفظ "سجدہ" سے بکثرت لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، حتیٰ کہ ایک گروہ نے تو اس سے استدلال کر کے بادشاہوں اور پیروں کے لیے سجدۂ تحیۃ اور سجدۂ تعظیمی کا جواز نکالا، اور دوسرے لوگوں کو اس قباحت سے بچنے کے لیے

(باقی صفحہ ...)

اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) کہ اگلی شریعتوں میں صرف سجدۂ عبادت غیر اللہ کے لیے حرام تھا، باقی رہا وہ سجدہ جو عبادت کے جذبہ سے خالی ہو، تو وہ خدا کے سوا دوسروں کو بھی کیا جا سکتا تھا، البتہ شریعت محمدی میں ہر قسم کا سجدہ غیر اللہ کے لیے حرام کر دیا گیا۔ لیکن یہ غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ لفظ "سجدہ" کو موجودہ اسلامی اصطلاح کا ہم معنی سمجھ لیا گیا، یعنی ہاتھ، گھٹنے اور پیشانی کا زمین پر ٹکانا۔ حالانکہ سجدہ کے اصل معنی محض جھکنے کے ہیں اور یہاں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ قدیم تہذیب میں یہ عام طریقہ تھا اور آج بھی بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ کسی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے، یا کسی کا استقبال کرنے کے لیے یا محض سلام کرنے کے لیے سینے پر ہاتھ رکھ کر کسی حد تک آگے کی طرف جھکا جائے۔ اسی جھکاؤ کے لیے عربی میں سجود اور انگریزی میں Bow کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بائبل میں اس کی بکثرت مثالیں ہم کو ملتی ہیں کہ قدیم زمانے میں یہ طریقہ آداب تہذیب میں شامل تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے خیمہ کی طرف تین آدمیوں کو آتے دیکھا تو وہ ان کے استقبال کے لیے دوڑے اور زمین تک جھکے۔ عربی توراۃ میں اس موقع پر جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: فلما نظر رکض لاستقبالهم من باب الخيمة وسجد الى الارض (تکوین ۱۸: ۳-۲) پھر جب موقع پر یہ ذکر آتا ہے کہ بنی حِتّ نے حضرت سارہ کے دفن کے لیے قبر کی زمین مفت دی وہاں اردو توراۃ کے الفاظ یہ ہیں: "ابرہام نے اٹھ کر اور بنی حِتّ کے آگے، جو اس ملک کے لوگ ہیں، آداب بجا لا کر ان سے یوں گفتگو کی"۔ اور جب ان لوگوں نے ایک قبر کی زمین نہیں بلکہ ایک پورا کھیت اور ایک غار نذر میں پیش کر دیا تب ابرہام اس ملک کے لوگوں کے سامنے جھکا۔" مگر عربی توراۃ میں ان دونوں مواقع پر "آداب بجا لانے اور جھکنے کے لیے" "سجدہ کرنے" ہی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں: فقام ابراهيم وسجد لشعب الارض بني حث (تکوین: اصحاح ۲۳ - آیت ۷) فسجد ابراهيم امام شعب الارض (اصحاح ۲۳ - آیت ۱۲)

انگریزی توراۃ میں ان مواقع پر جو الفاظ آئے ہیں وہ یہ ہیں:

Bowed himself toward the Ground.

Bowed himself to the People of the land.

And Abraham bowed down himself before the People of the land.

اس مضمون کی مثالیں توراۃ میں اور بھی موجود ہیں اور ان سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سجدہ کا مفہوم وہ ہے ہی نہیں جو اب اسلامی اصطلاح کے لفظ "سجدہ" سے سمجھا جاتا ہے۔

مجھے قید خانے سے نکالا، اور آپ لوگوں کو صحرا سے لا کر مجھ سے ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے، بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے! تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔[1]

[1] یہ چند فقرے جو اس موقع پر حضرت یوسف کی زبان سے نکلے ہیں وہ ایک سچے مومن کی سیرت کا عجیب دلکش نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ہم صحرائی گلہ بانوں کے خاندان کا ایک فرد، جس کو خود اس کے بھائیوں نے حسد کے مارے ہلاک کر دینا چاہا تھا، زندگی کے نشیب و فراز دیکھتا ہوا بالآخر دنیوی عروج کے انتہائی مقام پر پہنچ گیا ہے، اس کے قحط زدہ اہل خاندان اب اس کے دست نگر ہو کر اس کے حضور آئے ہیں اور وہ حاسد بھائی بھی، جو اس کو مار ڈالنا چاہتے تھے، اس کے تخت شاہی کے سامنے سرنگوں کھڑے ہیں۔ یہ موقع دنیا کے عام دستور کے مطابق فخر جتانے، ڈینگیں مارنے لگے اور شکوے کرنے، اور طعن و ملامت کے تیر برسانے کا تھا۔ مگر ایک سچا خدا پرست انسان اس موقع پر کچھ دوسرے ہی اخلاق ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنے اس عروج پر فخر کرنے کے بجائے اس خدا کے احسان کا اعتراف کرتا ہے جس نے اسے یہ مرتبہ عطا کیا۔ وہ خاندان والوں کو اس ظلم و ستم پر کوئی ملامت نہیں کرتا جو اوائل عمر میں انھوں نے اس پر کیے تھے، بلکہ اس کے برعکس اس بات پر شکر ادا کرتا ہے کہ خدا نے اتنے دنوں کی جدائی کے بعد تم لوگوں کو مجھ سے ملایا۔ وہ حاسد بھائیوں کے خلاف شکایت کا ایک لفظ زبان سے نہیں نکالتا حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے میرے ساتھ برائی کی تھی، بلکہ ان کی صفائی خود ہی اس طرح پیش کرتا ہے کہ شیطان نے میرے اور ان کے درمیان برائی ڈال دی تھی، اور پھر اس برائی کے بھی برے پہلو کو چھوڑ کر اس کا یہ اچھا پہلو پیش کرتا ہے کہ خدا جس مرتبے پر مجھے پہنچانا چاہتا تھا اس کے لیے یہ لطیف تدبیر اس نے فرمائی، یعنی بھائیوں سے شیطان نے جو کچھ کرایا اسی میں حکمت الٰہی کے مطابق میرے لیے خیر تھی۔ چند الفاظ میں یہ سب کچھ کہہ جانے کے بعد وہ بے اختیار اپنے خدا کے آگے جھک جاتا ہے، اس کا شکر ادا کرتا ہے کہ تو نے مجھے بادشاہی دی اور وہ قابلیتیں بخشیں جن کی بدولت میں قید خانے میں سڑنے کے بجائے آج دنیا کی سب سے بڑی سلطنت پر فرمانروائی کر رہا ہوں، اور آخر میں اس سے کچھ مانگتا ہے تو یہ مانگتا ہے کہ دنیا میں جب تک زندہ رہوں تیری بندگی و غلامی پر ثابت قدم رہوں، اور جب اس دنیا سے رخصت ہوں تو مجھے نیک بندوں کے ساتھ ملا دیا جائے —

(باقی صفحہ ۱۳ پر)

(اے محمدؐ!) یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں ورنہ تم اس وقت موجود نہ تھے
جب یوسفؑ کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کرکے سازش کی تھی۔ مگر تم خواہ کتنا ہی چاہو ان میں سے اکثر
لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں۔[۵] حالانکہ تم اس خدمت پر ان سے کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے ہو۔ یہ تو

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰) حضرت یوسفؑ کی اس قیمتی تقریر نے بھی بائبل اور تلمود میں کوئی جگہ نہیں پائی ہے۔ حیرت ہے کہ یہ کتابیں قصوں کی غیرضروری تفصیلات سے تو بھری پڑی ہیں، مگر جو چیزیں کوئی اخلاقی قدر وقیمت رکھتی ہیں اور جن سے انبیاء کی اصلی تعلیم اور ان کے حقیقی مشن اور ان کی سیرتوں کے سبق آموز پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، ان سے ان کتابوں کا دامن خالی ہے۔

یہاں یہ قصہ ختم ہو رہا ہے، اس لیے ناظرین کو پھر اس حقیقت پر متنبہ کر دینا ضروری ہے کہ قصۂ یوسف علیہ السلام کے متعلق قرآن کی یہ روایت اپنی جگہ ایک مستقل روایت ہے، بائبل یا تلمود کا چربہ نہیں ہے۔ تینوں کتابوں کا مقابل مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قصے کے متعدد اہم اجزاء میں قرآن کی روایت ان دونوں سے مختلف ہے۔ بعض چیزیں قرآن ان سے زائد بیان کرتا ہے، بعض ان سے کم، اور بعض میں ان کی تردید کرتا ہے۔ لہٰذا کسی کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قصہ سنایا وہ بنی اسرائیل سے سن لیا ہوگا۔

(حواشی صفحہ ہٰذا) [۵] یعنی ان لوگوں کی ہٹ دھرمی کا حال یہ ہے کہ تمہاری نبوت کی آزمائش کے لیے بہت سوچ سمجھ کر اور مشورے کرکے جو مطالبہ انھوں نے کیا تھا اسے تم نے بھری محفل میں برجستہ پورا کر دیا، اور اب شاید تم متوقع ہو گے کہ اس کے بعد تو انھیں یہ تسلیم کر لینے میں کوئی تامل نہ رہے گا کہ تم یہ قرآن خود تصنیف نہیں کرتے ہو بلکہ واقعی تم پر وحی آتی ہے، مگر یقین جانو کہ یہ اب بھی نہ مانیں گے اور اپنے انکار پر جمے رہنے کے لیے کوئی دوسرا بہانہ ڈھونڈ نکالیں گے، کیونکہ ان کے نہ ماننے کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ تمہاری صداقت کا اطمینان حاصل کرنے کے لیے یہ کھلے دل سے کوئی معقول دلیل چاہتے ہوں، اور وہ انھیں نہ ملی ہو، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمہاری بات نہیں ماننا چاہتے اور ان کو تلاش دراصل ماننے کے لیے کسی دلیل کی نہیں بلکہ نہ ماننے کے لیے کسی بہانے کی ہے ــــــ اس کلام سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی غلط فہمی کو رفع کرنا نہیں ہے، اگرچہ بظاہر خطاب آپ ہی سے ہے، بلکہ اس کا اصل مقصد مخاطب گروہ کو، جس کے مجمع میں یہ تقریر کی جا رہی تھی، ایک نہایت لطیف و بلیغ طریقے سے اس کی ہٹ دھرمی پر متنبہ کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی محفل میں آپ کو امتحان کے لیے بلایا تھا اور اچانک یہ مطالبہ کیا تھا کہ اگر تم نبی ہو تو بتاؤ بنی اسرائیل کے مصر جانے کا قصہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں ان کو وہیں اور اسی وقت پورا قصہ سنا دیا
(باقی حاشیہ صفحہ ۱۳ پر)

یہ ایک نصیحت ہے جو دنیا والوں کے لیے عام ہے۔[۵۲]

ع ۱۱ [۵۳] زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گذرتے رہتے ہیں اور ذرا توجہ نہیں کرتے۔[۵۴] ان میں سے اکثر اللہ کو مانتے ہیں مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) اور آخر میں یہ مختصر سا فقرہ کہکر آئینہ بھی ان کے سامنے رکھ دیا گیا کہ ہٹ دھرمو! اس میں اپنی صورت دیکھ لو، تم کس منہ سے امتحان لینے بیٹھے تھے؛ معقول انسان اگر امتحان لیتے ہیں تو اس لیے لیتے ہیں کہ اگر حق ثابت ہو جائے تو اسے مان لیں، مگر تم وہ لوگ ہو جو اپنا منہ مانگا ثبوت مل جانے پر بھی مان کر نہیں دیتے۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۵۲ اوپر کی تنبیہ کے بعد یہ دوسری لطیف تر تنبیہ ہے جس میں ملامت کا پہلو کم اور فہمائش کا پہلو زیادہ ہے۔ اس ارشاد کا خطاب بھی بظاہر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر اصل مخاطب کفار کا مجمع ہے اور اس کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اللہ کے بندو! غور کرو، تمہاری یہ ہٹ دھرمی کس قدر بے جا ہے۔ اگر پیغمبر نے اپنے کسی ذاتی مفاد کے لیے دعوت و تبلیغ کا یہ کام جاری کیا ہوتا یا اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی چاہا ہوتا تو بے شک تمہارے لیے یہ کہنے کا موقع تھا کہ ہم اس مطلبی آدمی کی بات کیوں مانیں، مگر تم دیکھ رہے ہو کہ یہ شخص بے غرض ہے، تمہاری اور دنیا بھر کی بھلائی کے لیے نصیحت کر رہا ہے اور اس میں اس کا اپنا کوئی مفاد پوشیدہ نہیں ہے، پھر اس کا مقابلہ اس ہٹ دھرمی سے کرنے میں آخر کیا معقولیت ہے۔ جو انسان سب کے بھلے کے لیے ایک بات بے غرضی کے ساتھ پیش کرے اس سے کسی کو خواہ مخواہ ضد کیوں ہو۔ کھلے دل سے اس کی بات سنو، دل کو لگتی ہو تو مانو، نہ لگتی ہو نہ مانو۔

۵۳ اوپر کے گیارہ رکوعوں میں حضرت یوسف کا قصہ ختم ہو گیا۔ اگر وحی الٰہی کا مقصد محض قصہ گوئی ہوتا تو اسی جگہ تقریر ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ مگر یہاں تو قصہ کسی اور مقصد کی خاطر کہا جاتا ہے اور اس مقصد کی تبلیغ کے لیے جو موقع بھی مل جائے اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ نہیں کیا جاتا۔ اب چونکہ لوگوں نے خود نبی کو بلایا تھا اور قصہ سننے کے لیے کان متوجہ تھے، اس لیے ان کے مطلب کی بات ختم کرتے ہی چند جملے اپنے مطلب کے بھی کہہ دیے گئے اور غایت درجہ اختصار کے ساتھ ان چند جملوں ہی میں نصیحت اور دعوت کا سارا مضمون سمیٹ دیا گیا ہے۔

۵۴ اس سے مقصد لوگوں کو ان کی غفلت پر متنبہ کرنا ہے۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز بجائے خود محض ایک چیز ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشانی بھی ہے جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو محض چیز ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۵ پر)

ٹھیراتے ہیں۔[۵۱] کیا یہ مطمئن ہیں کہ خدا کی طرف سے کوئی عذاب اُن کو دبوچ نہ لے گا یا بے خبری میں قیامت کی گھڑی اچانک ان پر نہ آ جائے گی؟[۵۲] تم ان سے صاف کہہ دو کہ "میرا راستہ تو یہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی، اور اللہ پاک ہے[۵۳] اور شرک کرنے والوں سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴) وہ انسان کا سا دیکھنا نہیں بلکہ جانوروں کا سا دیکھنا دیکھتے ہیں۔ درخت کو درخت، اور پہاڑ کو پہاڑ اور پانی کو پانی تو جانور بھی دیکھتا ہے، اور اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے ہر جانور ان چیزوں کا مصرف بھی جانتا ہے۔ مگر جس مقصد کے لیے انسان کو حواس کے ساتھ سوچنے والا دماغ بھی دیا گیا ہے، وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھے اور ان کا مصرف اور استعمال معلوم کرے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ حقیقت کی جستجو کرے اور ان نشانیوں کے ذریعہ سے اس کا سراغ لگائے۔ اسی معاملہ میں اکثر انسان غفلت برت رہے ہیں، اور یہی غفلت ہے جس نے ان کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے۔ اگر دلوں پر یہ قفل نہ چڑھا لیا گیا ہوتا تو پیغمبر کی بات سمجھنا اور ان کی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا لوگوں کے لیے اس قدر مشکل نہ ہو جاتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) [۵۱] یہ فطری نتیجہ ہے اس غفلت کا جس کی طرف اوپر کے فقرے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ جب لوگوں نے نشان راہ سے آنکھیں بند کیں تو سیدھے راستے سے ہٹ گئے اور اطراف کی جھاڑیوں میں پھنس کر رہ گئے۔ اس پر بھی کم انسان ایسے ہیں جو منزل کو بالکل ہی گم کر چکے ہوں اور جنہیں اس بات سے قطعی انکار ہو کہ خدا ان کا خالق و رازق ہے۔ بیشتر انسان جس گمراہی میں مبتلا ہیں وہ انکار خدا کی گمراہی نہیں بلکہ شرک کی گمراہی ہے۔ یعنی وہ یہ نہیں سمجھتے کہ خدا نہیں ہے بلکہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدائی کی حقیقت اور اس کی صفات، اختیارات، اور حقوق میں دوسرے بھی کسی نہ کسی طرح کے حصہ دار ہیں۔ یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہوتی اگر زمین و آسمان کی ان نشانیوں کو نگاہ عبرت سے دیکھا جاتا جو ہر جگہ اور ہر آن خدائی کی وحدت کا پتہ دے رہی ہیں۔

[۵۲] اس سے مقصود لوگوں کو چونکانا ہے کہ زمہلت زندگی کو دراز سمجھ کر اور حال امن کو دائم خیال کر کے فکر مآل کو کسی آنے والے وقت پر نہ ٹالو۔ کسی انسان کے پاس بھی اس امر کے لیے کوئی ضمانت نہیں ہے کہ اس کی مہلت حیات فلاں وقت تک یقیناً باقی رہے گی۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اچانک اس کی گرفتاری ہو جاتی ہے اور کہاں سے کس حال میں وہ پکڑ بلایا جاتا ہے۔ تمہارا شب و روز کا تجربہ ہے کہ یہ مستقبل ایک لمحہ پہلے بھی خبر نہیں دیتا کہ اس کے اندر تمہارے لیے کیا چھپا ہوا ہے۔ لہٰذا کچھ فکر کرنی ہے تو ابھی کر لو۔ زندگی کی جس راہ پر چلے جا رہے ہو اس پر آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ٹھیر کر سوچ لو کہ آیا یہ راستہ ٹھیک ہے؟ اس کے درست ہونے کے لیے کوئی واقعی حجت موجود ہے؟ اس کے درست ہونے کی کوئی دلیل آثار کائنات سے مل رہی ہے؟ اس پر چلنے کے جو نتائج تمہارے ابنائے نوع پہلے دیکھ چکے ہیں اور جو نتائج اب تمہارے تمدن میں رونما ہو رہے ہیں وہ بھی تصدیق کرتے ہیں کہ تم ٹھیک جا رہے ہو؟

[۵۳] یعنی ان باتوں سے پاک جو اس کی طرف منسوب کی جا رہی ہیں۔ ان نقائص، اور کمزوریوں سے پاک جو ہر مشرک کا عقیدہ سے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

(اے محمدؐ!) تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب بھی انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے، اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان قوموں کا انجام انھیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ اور یقیناً آخرت کا گھر ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر ہے جنھوں نے (پیغمبروں کی بات مان کر) تقویٰ کی روش اختیار کی۔ کیا اب بھی تم لوگ نہ سمجھو گے؟ [لہ] (پہلے پیغمبروں کے ساتھ بھی یہی ہوتا رہا ہے کہ وہ مدتوں نصیحت کرتے رہے اور لوگوں نے سن کر نہ دیا) یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور لوگوں نے بھی سمجھ لیا کہ اُن سے جھوٹ بولا گیا تھا، تو یکایک ہماری مدد پیغمبروں کو پہنچ گئی۔ پھر جب ایسا موقع آجاتا ہے تو ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ جسے ہم چاہتے ہیں بچا لیتے ہیں اور مجرموں پر سے تو ہمارا عذاب ٹالا ہی نہیں جا سکتا۔

اگلے لوگوں کے ان قصوں میں عقل و ہوش رکھنے والوں کے لیے عبرت ہے۔ یہ جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے یہ کوئی بناوٹی بات نہیں ہے بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہوئی ہیں انہی کی تصدیق ہے اور ہر
ع۱۲ چیز کی تفصیل [لہ] اور ایمان لانے والوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

(بقیہ صفحہ ۵) بنا پر لازماً اس کی طرف منسوب ہوتی ہیں۔ ان عیوب اور خطاؤں اور برائیوں سے پاک جن کا اس کی طرف منسوب ہونا شرک کا منطقی نتیجہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) [لہ] یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو دو تین جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی مفصل عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے: یہ لوگ تمھاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل ان کے شہر میں پیدا ہوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوا اس کے متعلق یہ کیسے مان لیں کہ یکایک ایک روز خدا نے اسے اپنا سفیر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوئی نوکھی بات نہیں ہے جس سے آج پہلی مرتبہ سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ سب بھی انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ اچانک ایک شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب بستیوں کے رہنے والوں میں سے ہی تھے۔ مسیح، موسیٰ، ابراہیم، نوح (علیہم السلام) آخر کون تھے؟ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوت اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد تخیلات اور بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاد، ثمود، مدین، اور قوم لوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گزرتے رہتے ہو۔ کیا وہاں سبق تمھیں نہیں ملا؟ یہ انجام جو انھوں نے دنیا میں دیکھا، یہی خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے اور جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کر لی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے، آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہے۔

[لہ] یعنی ہر وہ چیز جو انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ضروری ہے، اس کتاب میں صاف صاف کھول کر بیان کر دی گئی ہے۔

مقالات

دعوت کے طریقے

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پر ٹوپی۔ گاؤں گاؤں پھرے، اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے، خواہ وہ سنے یا نہ سنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گذر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چوراہے پر چار آدمی نظر آ جائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے۔ ریل میں، اسٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے، ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کرے، ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے۔ سننے والے تھک تھک جائیں لیکن وہ سنانے سے نہ تھکے، لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک کے سر پر مسلط رہے، لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں اور بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں لیکن وہ اسی جوش و انہماک کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی ضرورت ہو وعظ کہے، جہاں میلاد کی خواہش کی جائے میلاد پڑھ دے اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے وہاں خم ٹھونک کے میدان مناظرہ میں بھی اتر پڑے۔ یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ اور یہ ہے ایک سچے مبلغ کی صحیح تصویر جو ہمارے بہت سے دیندار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹفک طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے کے ممکن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں لیکن خیر و برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے جس کو ان کے خیال میں حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور

کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ (جس کے سوا کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہیں) ایک محترم و مقدس طریقہ ثابت ہو جائے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے آج کی صحبت میں ہم بتائیں گے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے بلکہ داعیان حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن سے اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہو۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں، جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقہ پر اصرار نہیں کیا ہے بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم و فن ترقی کرتا گیا ہے اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ و تعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دور تمدن میں جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا انبیاء کی تعلیم و تبلیغ بھی زبانی تھی۔ وہ نیکی اور سچائی کے کچھ اصول لوگوں کو زبانی آکر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے جو نسلاً بعد نسلٍ روایات کی شکل میں ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امتداد زمانہ سے وہ اصول فراموش ہو جاتے یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہو جاتیں تو اللہ تعالیٰ کسی اور نبی کو بھیجتا جو آکر اس تعلیم کو از سر نو تازہ کر دیتا۔ جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملہ میں سارا اعتماد شخصی ارتباط، زبانی اظہار اور قوت حافظہ پر رہا لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا جس نے ایک حد تک انسان کو ان چیزوں سے مستغنی کر دیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور ان کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہو گیا تو انبیائے کرام نے اس کو بھی اختیار فرما لیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے تورات کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم قلم کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ ... اور تو پڑھ اور تیرا خداوند وہ فیاض خدا ہے جس نے قلم سے

بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ (۳-۵ علق) نے تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز سکھائی جس سے وہ نا آشنا تھا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ انسان کو قلم کے استعمال کا اس نے ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیم دین کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے وہ اس لائق ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت —— کتاب —— کے پانے کا مستحق ہو۔ زبانی تعلیم کے مقابل میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح حاصل ہے اور اس میں اتمام حجت اور تبلیغ کامل کے جو پہلو ہیں ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کیے ہیں لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاء کا طریقہ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہی ہے جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق داعیان حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس اور ریڈیو وغیرہ نے انسان کی قوت ابلاغ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جاسکتا ہے، مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام اور خواص سب کے ذہن نشین کی جاسکتی ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہل حق یہ خیال کر کے ان چیزوں کو نظرانداز کر دیں کہ انبیاء نے تبلیغ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے بلکہ دروازہ دروازہ پر پہنچ کر ایک ایک شخص پر تبلیغ کی ہے اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ گھر گھر پہنچ کر لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیاء کے طریقہ کی پیروی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے جو وہ اس لیے دے رہا ہے تاکہ جب تک آپ اپنے "دیندارانہ" طریقہ پر چل کر دو چار آدمیوں سے کوئی بات کہیں۔ اس وقت تک وہ ان سائنٹفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروروں انسانوں تک اپنی دعوت باطل نہایت موثر طریقہ پر پہنچا دے۔ شیطان نے یہی دھوکہ دے کر اکثر اہل حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہنچا دیا ہے اور ان کے

مقابل میں خود اپنا پلہ بھاری رکھا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں ہم پیچھے ہیں اور وہ آگے ہے اور دونوں کی کوششوں کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور یہی صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اہل حق ان زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فی فیصدی شیطان کے تصرف میں ہونے کی وجہ سے باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

۲۔ دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹفک نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیے تاکہ باطل سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس کام میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ دعوت وقت کے معیار کے لحاظ سے باوقار ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے خیالات کو سنانے اور دوسروں کے خیالات کو سننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہوں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہ ہو، تو اہل حق ان کو اپنائیں اور تبلیغ حق میں ان سے کام لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں ترقی پا چکے تھے اور دعوت کے نقطۂ نظر سے کارآمد تھے۔ اول اول جب آپ نے اپنے خاندان کے اکابر کو —— جو درحقیقت وقت کے بھی اکابر تھے —— اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو اس کے لیے طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو اور تمام خاندانِ مطلب کو کھانے پر بلاؤ۔ حضرت علی نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندان مطلب جمع ہوا۔ حضرت حمزہ، ابو طالب اور عباس سب لوگ شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ "اس بارِ گراں کو اٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟" اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اٹھ کر نہایت موثر الفاظ میں فرمایا کہ "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نو عمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلعم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے مثلاً مکہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے۔ حج کے زمانے میں جو قبیلے مکہ کے آس پاس آکے ٹھہر جاتے آپ ان کے سرداروں سے ملتے اور ان کو دعوت اسلام دیتے۔ بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے۔ عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، آپ ان بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے۔ بہت سے لوگوں کو آپ نے خطوط کے ذریعے بھی دعوت دی۔ غرض اس زمانہ میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عہد میں لوگ انہی طریقوں سے اثر پذیر ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکے ہیں اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں انہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے طبائع اور حالات کے مناسب ہیں۔ جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں اسی طرح ان کو سنانے کی کوشش کی جائے، جس طریق کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اسی طریق کار کو اختیار کیا جائے۔ اگر ایک داعی ـــ بالخصوص ایک داعی حق ـــ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کے نزدیک وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی ہے اور اس کی مخلصانہ کوششوں کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجام سے نہ بچا سکے گی۔ اگر ایک شخص آج دعوت دین کے لیے یورپ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس بات پر مصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا تو خواہ یہ شخص کتنا ہی مخلص ہو

لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے اپنی محنت بھی رائگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزت بھی خاک میں ملائے گا۔ اس سلسلہ میں ایک داعی حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں کوئی پہلو اخلاق کے منافی ہو۔ اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار ہی کرنا پڑ جائے تو اس کو اس اخلاقی برائی سے پاک کرلے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اول اول اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہ صفا پر چڑھکر جو نعرہ لگایا اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانیوالا اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہوجاتا تھا، چنانچہ عربی میں اس کو "النذیر العریان" کہتے بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چوکنا کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیر عریان کا ہوتا تھا لیکن عریاں ہونا چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی تھی اس وجہ سے آپ نے اس برائی سے اس طریقہ کو پاک کرلیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہوچکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو برائی کا ہے تو اس برائی کی وجہ سے ان کو کلیتہً رد کردینا کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ کرنا یہ چاہیے کہ ان طریقوں کو برائیوں سے پاک کرکے ان کو مقصد حق میں استعمال کیا جائے۔

آج متمدن ملکوں میں کسی فکر کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہوچکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں اسی طرح بھلائیوں کے پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ یا تو ان کو ان کی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ اختیار کرتے ہیں خواہ کسی مقصد حق ہی کے لیے استعمال کریں یا اس خیال سے سرے سے ان کو ہاتھ ہی نہیں لگانا چاہتے کہ ان میں بعض پہلو برائی کے بھی ہیں۔

یہ وہ اصولی ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق لحاظ رکھنے کی ہیں جو ایک داعی حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کرینگے جن سے بہرحال ایک داعی حق کو احتراز کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہوں بہت سی ہوسکتی ہیں۔ ان سب کو گننا مشکل ہوگا صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے جن سے فی الجملہ اندازہ ہوسکے گا کہ داعیان حق کو کس قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

الف۔ ایک داعی حق کو استمالت کے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے جن سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اس حد تک نہیں بڑھنا چاہیے کہ داعی کو نہ اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش رہے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا کچھ خیال رہے، اور نہ اپنی دعوت کے مرتبہ اور مقام ہی کی کچھ پروا رہ جائے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانے کے درپے ہونا، بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال کا نہ پیدا ہونے پائے۔ اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو اس حد تک جھکنے پر مجبور کر رہی ہے اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔ سورہ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلعم کو متکبرین کی اسی طرح کی استمالت سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا ذکر اسی پہلو سے ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى	لیکن جو بے پروائی برتتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو حالانکہ
ـكَ اَلَّا يَزَّكّٰى وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى	تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر وہ اپنے آپ کو نہ سدھارے
ـيَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ	اور وہ جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور اپنے خدا

فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهٗ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ

(۵ - ۱۶ عبس)

سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں یہ تو بس ایک یاددہانی ہے سو جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھائے معزز، بلند رتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوفا منشیوں کے ہاتھ ہیں

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے یا چمٹنے والے گداگروں کی طرح جو راہ گیر مل جائے اس کے پیچھے پڑ جائے اور جب تک اس کو سنا نہ لے یا اس سے کچھ سن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ:

ولا الفينك تاتي القوم وهم في حديث من حديثهم فتقص عليهم ولكن انصت فاذا امروك فحدثهم وهم يشتهونه

(بخاری)

میں تمھیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں ہوں اور اسی حال میں تم ان کو سنانا شروع کرو بلکہ خاموش رہو اور جب وہ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں۔

عن شقيق قال كان عبد الله بن مسعود يذكر الناس في كل خميس فقال له رجل يا ابا عبد الرحمن لوددت انك ذكرتنا في كل يوم قال اما انه يمنعني من ذلك اني اكره ان املكم واني اتخولكم بالموعظة كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخولنا بها مخافة السامة علينا

شقیق سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبدالرحمن میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہا کریں۔ انھوں نے کہا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کرکے تمھیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح آنحضرت صلعم ہم کو ناغہ کرکے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔

ب۔ داعی حق کو کبھی کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے دعوت کے

مقصد کے بالکل منافی ہو مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدت سے دعوت و تبلیغ کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہمارے اہل فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں جو ہمارے عربی مدرسوں میں پڑھائی بھی جاتی ہیں لیکن دعوت حق کی روح سے جس قدر بعید یہ طریقہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجہ کی اجازت دی ہے لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا جس کی تعلیم ہماری دینی درسگاہوں میں دی جاتی ہے اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے اہل مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے انہی دو لفظوں سے ہے اس وجہ سے ہم مختصراً ان دونوں لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ انبیا کے مجادلہ اور محاجہ اور مروجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن شریف میں دو طرح کے مجادلہ کا ذکر آتا ہے، ایک مجادلہ باطل، دوسرا مجادلہ حسن۔ مجادلہ باطل کو قرآن نے کفار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں پر گرفت، وہی بے فائدہ کج بحثیوں میں تضیع وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا، وہی لا یعنی موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں کی خصوصیات میں شامل ہیں وہی قرآن نے مجادلہ باطل کی خصوصیات بھی بتائی ہیں اور اہل حق کو نہایت سختی کے ساتھ ان سے روکا ہے اور صرف احسن طریقہ سے مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ کی وضاحت علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے خود کر دی ہے تاکہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک و اتحاد ہے اس مشترک پہلو کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصول سے لازمی طور طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول

کرنے کی طرف مائل ہو۔ مثلاً فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي
هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا
آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ
وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ
(۴۶ ۔ عنکبوت)

اور نہ مناظرہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طریق سے جو بہتر ہے اور جنھوں نے ان میں سے اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کو تو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ اور کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے ہمارا تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اسی اصول کے اہتمام میں اہل کتاب کے سامنے توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جب اہل ایمان اور اہل کتاب میں بحیثیت اصول کے یہ چیز یکساں طور پر مسلّم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم کوئی اختلاف کیوں ہو!

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا
نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا
أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا
اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴ ۔ آل عمران)

کہہ دو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مسلّم ہے وہ یہ کہ ہم نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ بنائیں کسی چیز کو اس کا ساتھی اور نہ بنائے ہم میں سے کوئی کسی کو رب اللہ کے سوا پس اگر وہ (اس کے مقتضیات) سے اعراض کریں تو اعلان کر دو کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے، مخاطب پر محبت، اعتماد، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطور مثال ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پر محبت اصرار و اظہار کو مجادلہ کے ... سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے ...

سے جو مجادلہ کیا ہے قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ مجادلہ ان کی دردمندی اور دل سوزی کا نتیجہ تھا۔ اس مجادلہ کی تفصیل تورات میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

تب ابرہام نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ملیں تب اس نے کہا میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں اسے بیس کی خاطر بھی نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابرہام اپنے مکان کو لوٹا۔" (پیدائش ۱۸: ۲۳-۳۳)

اس طرزِ کلام، اس طرزِ تخاطب اور اس طرزِ استدلال و اصرار کو قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے اور اس مجادلہ کی تعریف فرمائی ہے۔ اگر لوگ انہی مجادلوں کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل قرار دیتے ہیں تو چاہیے کہ جو روح اس مجادلہ کے اندر ہے وہی روح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی لطف و محبت اور دل سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں نہ کہ سارا اہتمام رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور اس کا نام رکھ لیا جائے مناظرہ اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاء کی زندگی سے

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک محاجہ بھی نقل فرمایا ہے جو ایک بادشاہ اور ان کے درمیان ہوا ہے اس محاجہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے" اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ "میں مارتا اور جلاتا ہوں" اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال"۔ اس مناظرہ کو اگر مناظرہ کے اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ "میں مارتا ہوں اور جلاتا ہوں" بہت کچھ معارضہ کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیا بلکہ جونہی ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ یہ شخص مناظرہ اور اپنی بات کی پچ کرنے پر تل گیا ہے وہ ایک مسکت بات کہکر فوراً علیحدہ ہو گئے جس سے فی الجملہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعی حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا و سمجھنا نہیں چاہتا بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اتر آیا ہے تو اس کے منانے کے درپے نہیں ہونا چاہیے بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے۔

ایک ضروری معذرت

اس پرچہ میں "زکوۃ" والے مضمون کی قسط نہیں پیش کی جا رہی ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ اعداد و شمار کے متعلق جن کتابوں کی ضرورت تھی۔ وہ خلاف توقع بروقت نہیں مل سکیں۔ ضروری کتابوں کے مہیا ہو جاتے ہی اس سلسلہ کو مکمل کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

(نعیم صدیقی)

اجتماع الہ آباد میں افتتاحی تقریر (۱)

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

(اجتماع الہ آباد کی رپورٹ بعض اسباب سے ابتک شائع نہ ہوئی۔ یہ دو تقریریں اس سے لے کر اس وجہ سے شائع کی جاتی ہیں کہ اس وقت جب کہ حلقہ وار اجتماعات ہو رہے ہیں ان باتوں کی یاد دہانی مفید ہوگی جو ان تقریروں میں کہی گئی ہیں)۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد:

رفقائے جماعت، حاضرین اور خواتین!

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے موقع پر جب کہ ہم اپنے سالانہ اجتماع کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں، امیر جماعت، جیسا کہ آپ کو معلوم ہوا، اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اجتماع کی کارروائیوں کی نگرانی کرنے سے معذور ہیں۔ اس کمی کو آپ جس قدر محسوس کر رہے ہوں گے اس سے زیادہ میں خود محسوس کر رہا ہوں لیکن یہ جماعت ہی کے مصالح کا تقاضا ہے کہ ان کو آرام کرنے کا موقع دیا جائے اور اس بات پر مجبور نہ کیا جائے کہ وہ خواہ مخواہ اجتماع کی کارروائیوں میں حصہ ہی لیں۔ یہاں وہ موجود ہیں اور تمام اہم امور میں آسانی سے ان کی ہدایات اور مشورے حاصل ہوتے رہیں گے۔ اور یہ کام جس حد تک ضروری ہے، میں خود انجام دے لوں گا۔ آپ نہ ان سے ملنے کی زیادہ خواہش کریں اور نہ ان کی تقریروں ہی کے لیے زیادہ اصرار کریں۔ البتہ یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جلد صحت بخشے اور ان کی بیماری کی وجہ سے اس وقت جو اہم ذمہ داری مجھ پر آ پڑی ہے اللہ تعالیٰ اس کے ادا کرنے کی مجھ میں ہمت اور قابلیت عطا فرمائے۔

ذکر الٰہی کی تاکید اس اجتماع کا افتتاح کرتے ہوئے سب سے پہلے میں آپ کو ذکر الٰہی کی نصیحت کرتا ہوں۔ یوں تو اللہ کی یاد انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی کے لیے ہر آن اسی طرح ضروری اور ناگزیر ہے

جس طرح ہماری مادی زندگی کے لیے سانس لیکن ان مواقع پر خصوصیت کے ساتھ اس کا اہتمام ہونا چاہیے جہاں خدا سے غفلت کے اسباب و محرکات زیادہ جمع ہو جائیں۔ ایسے مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو خاص طور پر اللہ کی یاد کے التزام کی تاکید فرمایا کرتے تھے اور چونکہ میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے لیے یہ موقع بھی ان مواقع میں سے ہے جہاں بہت سی چیزیں آپ کو خدا سے غافل کر سکتی ہیں اس وجہ سے میں خصوصیت کے ساتھ آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد کی تاکید کرتا ہوں۔ یہ یاد ہی آپ کے فکر و نظر کو روشن رکھے گی اور آپ جن باتوں پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اسی کی مدد سے ان میں آپ کو صحیح نتائج پر پہنچنے کی توفیق حاصل ہوگی۔ یہی چیز آپ کو اس وقت ہجو، غیبت اور دوسروں کی توہین و تحقیر سے بچائے گی جب آپ اپنے خیموں اور شامیانوں میں اکٹھے ہوں گے اور یہی چیز آپ کے دلوں اور زبانوں کی ان اوقات میں حفاظت کرے گی جبکہ آپ کی رایوں میں اختلاف اور خیالات میں تصادم کی کوئی وجہ پیدا ہوگی اور اسی چیز کی مدد سے آپ اپنی اس مسافرانہ زندگی کے بے شمار مشکل مرحلوں میں اپنے اخلاق اور ایمان کو فتنوں سے بچا سکیں گے۔ اگر آپ نے اس کا اہتمام نہ رکھا تو ہر قدم پر آپ سے لغزش کا اندیشہ ہے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کا عزم لے کر اٹھے ہیں۔ اس طرح کی جماعت کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت اپنے قول و فعل کی کڑی نگرانی رکھے کہ اس سے کوئی بات ایسی نہ صادر ہو جائے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور ایسا صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل ہر آن خدا کی یاد سے معمور ہوں۔

ذکر الٰہی کا صحیح مفہوم

ذکرِ الٰہی کے لفظ سے کہیں آپ کو غلط فہمی نہ ہو۔ میرے نزدیک ذکر الٰہی کا مفہوم اس کے مروجہ مفہوم سے بہت وسیع ہے۔ میں صرف زبان سے 'سبحان اللہ، سبحان اللہ' کے ورد کو ذکر نہیں سمجھتا۔ ایسا ذکر اکثر صرف ایک مشغلۂ زبان بن کے رہ جاتا ہے اور انسان کی زندگی کی کوئی حفاظت نہیں کرتا۔ میرے خیال میں ذکر کے ساتھ فکر ضروری ہے۔ جو ذکر فکر سے خالی ہو وہ موثر نہیں ہوتا۔ آپ اگر ذکر کی برکتوں سے پورے طور پر بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں تو دل سے اللہ کا، اس کی اعلیٰ صفات کا، اس کے عجائب تصرفات کا، اس کی قدرتوں اور حکمتوں کا، اور اس کے اس عہد کا، جو آپ نے اس سے باندھا ہے۔ اور اس کے ان وعدوں اور وعیدوں کا جو پابندی عہد یا نقضِ عہد کی صورت میں اس کی طرف سے آپ کے لیے

مقرر ہیں۔ دھیان رکھیے اور جو کچھ کیجیے اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے کیجیے۔ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلے وہ اللہ کی مرضی کے مطابق ہو اور آپ کا جو قدم بھی اٹھے وہ خدا کی راہ میں ہو، شیطان کی راہ میں نہ ہو۔ یہی ذکر ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے آپ سے مطالبہ کیا ہے۔ نہ یہ کہ آپ اس کے نام کو تو صبح شام جپتے رہیں اور اس کے کاموں سے غافل ہو جائیں۔ خدا کے ہاں اس ذکر کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اگر آپ واقعی اللہ کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو اس عہد کو یاد رکھیے جو آپ کے اور اس کے درمیان اس کے رسول کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ یہ عہد اللہ کی پوری شریعت پر حاوی ہے اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کا اہتمام و التزام اور اسی کے اقامت کی جدوجہد وہ حقیقی ذکر ہے جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے: فاذکرونی اذکرکم واشکروا لی ولا تکفرون (۱۵۲ بقرہ) (پس میرے عہد کو یاد رکھو جو تم نے مجھ سے کیا ہے میں اس عہد کو یاد رکھوں گا جو میں نے تم سے کیا ہے اور میں نے شریعت کی جو نعمت تم پر نازل کی ہے اس پر میرے شکرگزار رہنا اور میری ناشکری نہ کرنا)۔ یہی ذکر ہے جس کی میں اس وقت آپ کو تاکید کر رہا ہوں اور اگر آپ نے اس سے غفلت برتی تو یہ سب کچھ کرنے کے باوجود، جو میں یہاں دیکھ رہا ہوں، میں یہ سمجھوں گا کہ آپ نے اپنا وقت بھی ضائع کیا اور مال بھی برباد کیا۔ اور یہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسران ہوگا۔

نظم کی پابندی کا اہتمام

دوسری چیز جس کی اس موقع پر تاکید ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ نظم کی پوری پابندی کا خیال رکھیے۔ مختلف شعبوں کے منتظمین کی طرف سے آپ کو جو ہدایات ملیں ان کی سرمو خلاف ورزی نہ ہو۔ نماز کی جگہ، کھانا کھانے کی جگہ، اجتماع کی جگہ آپ کی نقل و حرکت ایک منظم اور باوقار جماعت کی سی ہو۔ کہیں ہڑبونگ اور ہڑبڑ کی صورت نہ پیدا ہونے پائے۔ اس سلسلہ میں یہ حقیقت پیش نظر رکھیے کہ ڈسپلن کے تقاضوں کو پورا کرنا دوسروں کے نزدیک صرف ایک اجتماعی اخلاق ہے جس کی خلاف ورزی کرنے والا صرف سوسائٹی میں نکو بنتا ہے مگر ایک مسلمان کے نزدیک اس کی حیثیت ایک مذہبی فریضہ کی ہے جس کی خلاف ورزی سے آخرت میں خدا اور رسول کی ناخوشی بھی متصور ہے اور دنیا میں بھی انسان ذلیل ہوتا ہے۔ جماعتی زندگی کے بقا اور ترقی کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے ان کا حکم خود اللہ اور رسول نے دیا ہے اور ان کی پابندی کا ہر مسلمان سے مطالبہ کیا ہے۔ پس جن لوگوں کا جماعتی اخلاق

کمزور ہے اور یہ نہیں جانتے کہ ایک فرد کو جماعت کے اندر کس سیرت اور کس اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ صرف ایک اخلاقی فضیلت سے محروم ہیں بلکہ حقیقت میں جس قدر ان کا جماعتی اخلاق کمزور ہے اسی قدر ان کی دینداری میں ضعف ہے۔ کوئی مسلمان اعلیٰ درجہ کی جماعتی سیرت کے بغیر اعلیٰ درجہ کا دیندار مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ وہ کتنے ہی روزے رکھے اور کتنی ہی نمازیں پڑھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے بعثت لاتمم مکارم الاخلاق (میں اعلیٰ اخلاق کی ساری باتوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں)۔ اس اعلیٰ اخلاق کا سب سے اعلیٰ نمونہ اگر خود مسلمان نہ پیش کر سکیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اس مقصد سے غافل ہو گئے جس کے لیے آنحضرت صلعم بعثت ہوئی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق کی جو تعلیم دی اور اس کا اثر عربوں جیسی جاہل اور اجڈ قوم پر جو کچھ پڑا اس کا کچھ اندازہ ایرانی سپہ سالار رستم کے اس فقرہ سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فوجوں کی نمازوں کی صفیں دیکھ کر کہا تھا کہ اکل عمر کبدی یعلم الکلاب الاداب (عمر تو میرا کلیجہ کھا گیا، یہ تو کتوں کو ڈسپلن کی تعلیم دے رہا ہے)۔ جس جماعت کے ڈسپلن پر ایران جیسی متمدن قوم کے سپہ سالار کو رشک آئے اس جماعت کی جماعتی سیرت کا تصور کیجیے اور پھر اس سے اپنا موازنہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کا اجتماعی اخلاق اس سے کوئی نسبت نہیں رکھتا بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج آپ اسی مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے چلے تھے۔ یہاں تک کہ ایک معمولی سا اجتماع آپ کی اجتماعی سیرت کی تمام کمزوریوں کو نمایاں کر دیتا ہے اور ایسے بھونڈے طریقہ پر نمایاں کر دیتا ہے کہ آپ کے مستقبل کی طرف سے کچھ مایوسی سی ہونے لگتی ہے کہ جو لوگ اتنی چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں پورے نہیں اترتے وہ بڑے بڑے امتحانوں میں کسی مضبوط اجتماعی کیرکٹر کا کیا ثبوت دے سکیں گے؟

میں نے ایک لمبا سفر ابھی ابھی آپ کے ساتھ کیا ہے۔ اس سفر میں آپ کی سیرت کا جو مظاہرہ میں نے دیکھا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے بلکہ اگر سچ پوچھیے تو تھوڑی سی تکلیف ہوئی ہے۔ سفر میں جس ایثار، جس تحمل، جس وقار کی ضرورت ہے اس کا ابھی بہت تھوڑا حصہ آپ میں نظر آیا۔ مختلف مواقع پر آپ نے جس بے صبری اور جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے وہ ریل کے عام مسافروں سے کچھ مختلف نہیں تھی

آپ نے ایسے بہت سے لوگوں کو تکلیفیں بھی پہنچائی ہیں جن سے معافی مانگنے کا بھی اب آپ کے لیے کوئی موقع باقی نہیں رہا۔ سفر میں آپ کا وقت بیشتر اسی قسم کی باتوں میں گزرا جن میں ریل کے عام مسافر گذارتے ہیں۔ میں نے کبھی کبھی یہ بات بھی محسوس کی کہ جماعت کے ارکان نے آپس میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کا سلوک نہیں کیا جو ٹھیک اسلامی اخلاق کا تقاضا تھا بلکہ سفر میں آزمائش کے مواقع پر ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئے۔ یہ علامتیں اچھی نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے اندر ابھی اسلامی سیرت کی تعمیر بڑی سست رفتاری سے ہو رہی ہے۔ مجھے ان باتوں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے لیکن حق نصیحت کا تقاضا ہے کہ میں اس شرم کی پروا کیے بغیر آپ کی کوتاہیوں پر آپ کو ملامت کروں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس اعلیٰ مقصد کو یاد رکھیں گے جس کے لیے آپ اٹھے ہیں اور اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے جس انفرادی اور اجتماعی سیرت کی ضرورت ہے اس کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے پوری سرگرمی سے کام لیں گے اور جس جگہ ہوں گے — بازار ہو یا اسٹیشن، ریل ہو یا سڑک — ہر جگہ اسی سیرت کا مظاہرہ کریں گے۔

اجتماعات کا مقصد ہمارے اجتماعات کا مقصد آپ کو معلوم ہے، وعظ گوئی اور تقریر نہیں ہے۔ ہم نے اس کام کے لیے آپ کا وقت اور روپیہ نہیں خرچ کرایا ہے۔ بلکہ ہمارے پیش نظر چند اہم مقاصد ہیں جن کے لیے یہ اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں اور نہایت ضروری ہے کہ اس موقع پر آپ ان کو سامنے رکھیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ہنگامہ آپ کو ان سے غافل کر دے اور یہ تمام درد سر لاحاصل ہی رہ جائے۔

ان اجتماعات کا پہلا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کو ایک خاص نصب العین کے عشق نے باہم گرجوڑ دیا ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں۔ ایک دوسرے کے حالات اور مشکلات معلوم کر سکیں۔ اور اصل مقصد کی راہ میں ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ آج بھی آپ ممکن حد تک آپس میں تعاون اور اشتراک عمل کی راہیں کھول لیں گے اور آئندہ بھی جب ضرورت پیش آئے گی آپ کو بآسانی آپس میں جوڑا ملایا جا سکے گا اور ایک مقصد کے لیے ایک راہ میں آپ کی قوتوں اور قابلیتوں کو استعمال کیا جا سکے گا۔ یہ مقصد چاہتا ہے کہ آپ اپنی فرصت کے اوقات فضول باتوں میں ضائع کرنے کی جگہ باہم گر تعارف اور ملاقاتیں پیدا کرنے میں صرف کریں۔ اگر یہ کام

آپ حضرات اس کے اصل مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا تو اس اجتماع کے ایک بنیادی مقصد کو پورا کریں گے اور اس سے آپ کی شخصی زندگی کو بھی فوائد پہنچیں گے اور آپ کی جماعتی زندگی میں بھی اس سے مفید نتائج مترتب ہوں گے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم تبلیغ و دعوت کے کام کو صرف لٹریچر کی اشاعت تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لٹریچر سے لوگوں میں جو فکر صالح پیدا ہو رہا ہے بر سر موقع پہنچکر اس کی آبیاری کا سامان بھی کریں۔ اس غرض کے لیے ہم یہ سالانہ اجتماع ہندوستان کے مختلف حصوں میں کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہر حصہ ملک کے لوگوں تک ہم اپنی دعوت براہ راست پہنچا سکیں اور جو لوگ ہم سے ملنا چاہیں بآسانی ہم سے مل کر اپنے شبہات و شکوک ـــ اگر کچھ ہوں ـــ دور کر سکیں۔ اس مقصد کو پوری طرح حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے ارکان میں سے جو حضرات جماعت کے مقاصد کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوئی قابلیت رکھتے ہیں یا معترضین کے شبہات و اعتراضات کو دور کر سکتے ہیں وہ اجتماع عام سے فرصت پانے کے بعد اپنا بیشتر وقت ان لوگوں کے ساتھ صرف کریں جو اس موقع پر ہندوستان کے مختلف حصوں سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور جماعت کے مقصد کو سمجھنا چاہتے ہیں یا اس کے متعلق کچھ شبہات دور کرنا چاہتے ہیں۔

ہمدردانِ جماعت سے خطاب اس موقع پر چند باتیں ہمدردان جماعت سے بھی کہنی ہیں۔ امید ہے کہ وہ توجہ سے سنیں گے۔ اور میری تلخ نوائی کو معاف کریں گے۔

ہم نے جماعت کے نظام کے ساتھ ہمدردوں کا ایک شعبہ محض بعض وقتی اور عارضی مصالح کے لیے رکھا ہے لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے ایسے لوگوں کے لیے بھی یہ شعبہ مامن کا کام دے رہا ہے جن کی اصلی جگہ جماعت کے نظام کے اندر تھی نہ کہ ہمدردوں کی صف میں۔ یہ حضرات بلا کسی سبب معقول کے محض اپنی بعض نفسی کمزوریوں کی وجہ سے اس آڑ میں چھپ بیٹھے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ ہمدردی ان کو اس حق سے سبکدوش کر دے گی جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد ہو رہا ہے۔ یہ ایک سخت غلط فہمی ہے جس کا دور ہونا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض صرف اس طرح ادا نہیں ہو سکتے کہ آپ اس

جماعت کے ساتھ فی الجملہ ہمدردی رکھتے ہیں جو ان فرائض کو پورا کرنے کے لیے اٹھی ہے بلکہ آج ان سے ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ آپ اپنا تمام سرمایہ زندگی اس جماعت کو برپا کرنے میں لگا دیں جو اس مقصد کے لیے اٹھے۔ اگر آپ کے سامنے کوئی عاجز کر دینے والی رکاوٹ نہیں ہے تو آپ کا فرض ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اس جماعت کی صف اول میں پہنچنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرے تاکہ وقت کی بے روح فضا میں ایک حرکت پیدا ہو اور جو راہ بند ہے اس کے کھولنے کے لیے دلوں میں ولولہ ابھرے۔ مجرد دعاگوئی اور اظہار ہمدردی کو ادائے فرض کی ایک قسم سمجھ لینا اور اس پر قانع ہو جانا سخت پست ہمتی اور کمزوری کی بات ہے۔ یہ درحقیقت راہ کی مشکلات سے مرعوب ہو کر نفس کی خواہشوں کے ساتھ مصالحت کی ایک صورت ہے جو ممکن ہے ایک شخص کے خلوص نیت کی وجہ سے نفاق کے حکم میں نہ آئے لیکن بہرحال یہ ایمان کے حقیقی مقتضا سے بہت دور ہے۔ اور میں اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ ایک مسلمان مصالحت کی یہ صورت اس وقت سوچے جب کہ اقامت دین کی جدوجہد کی دعوت بلند ہو چکی ہو اور ہر شخص سے مطالبہ کر رہی ہو کہ جس کے پاس خدا کی بخشی ہوئی جو قوت وقابلیت بھی موجود ہے اس کو لے کر میدان میں اتر پڑے۔ اقامت دین کا فرض ایسا فرض نہیں ہے جو محض اس طرح ادا ہو سکے کہ آپ اس جماعت کے ہمدردوں میں داخل ہو جائیں جو اس مقصد کے لیے کھڑی ہو رہی ہے۔ اس کے لیے آپ کو ہر ذمہ داری لینے کے لیے خود آگے بڑھنا چاہیے اور جذبہ شوق کے ساتھ بڑھنا چاہیے۔ اس طرح کہ آپ کا بڑھنا ساتھیوں میں ہمت اور دوسروں میں ولولہ پیدا کرے نہ اس طرح کہ آپ کے رویہ کو دیکھ کر دوسروں پر بھی مصلحت بینی اور احتیاط کی کمزوری مسلط ہو جائے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم بعض اوقات اس مسئلہ پر غور کرنے لگ جاتے ہیں کہ ہمدردوں کا ایک مستقل شعبہ قائم رکھنا کچھ مفید ہے یا نہیں۔ بہرحال اس سوال کا کوئی قطعی فیصلہ تو ابھی ہم نہیں کر سکے ہیں لیکن اتنی بات تو بالکل صاف معلوم ہوتی ہے کہ بلا کسی بہت ہی معقول عذر کے کسی نیک نیت اور مخلص آدمی کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ حق کے علمبرداروں کی صف میں کھڑے ہونے کی جگہ اس کے

ہمدردوں کے گوشۂ عافیت میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ دین کے خدمت گذاروں کی اصلی قسم ایک ہی ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی تحفظ اور استثناء کے اس کی بیعت اور خدمت کا عہد باندھتے ہیں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ اگر کسی بات کی گنجائش ہے تو یہ ہے کہ اقامتِ دین کی جد و جہد کے ابتدائی مراحل میں بعض خاص حالات کے لوگوں کے لیے کچھ رخصتیں رکھی جائیں لیکن یہ رخصتیں عارضی ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب یہ ساری رخصتیں اڑ جاتی ہیں اور حضرت مسیحؑ کے الفاظ میں صاف صاف اعلان کر دیا جاتا ہے کہ "جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ ہمارے دشمن ہیں" جب اصلی قسم انہی لوگوں کی ٹھیری تو بہتر یہی ہے کہ انہی لوگوں کی راہ اختیار کی جائے نہ کہ اس شاخ پر اپنا آشیانہ بنایا جائے جو بہرحال ایک دن کاٹ ڈالی جائے گی۔

ہم آپ کے سامنے اللہ کا دین پیش کر رہے ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ یہ آپ کی زندگی کا صرف ایک جزء نہیں ہے بلکہ یہی کل ہے۔ اگر ہماری بات میں کوئی غلطی اور ہمارے استدلال میں کوئی خامی ہے تو آپ اس کو واضح کر دیجیے تاکہ ہم اس غلطی کی اصلاح کر لیں اور اس خامی کو دور کر دیں لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ حق وہی ہے جو ہم پیش کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے آپؐ اللہ کی حجت تمام کر دی اور آپ کے لیے حق سے اعراض یا انحراف کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی۔ ایسی صورت میں آپ کے لیے صحیح راہ صرف ایک ہی ہو سکتی ہے کہ اس حق کو آپ مردانہ وار قبول کریں جو آپ پر واضح ہو چکا ہے۔ نہ یہ کہ قبول کر کے بھی آپ عملاً قبول نہ کرنے والوں ہی کی صف میں رہیں۔

آپ حضرات میں سے جن لوگوں کے ذہن میں ہماری جماعت کی دعوت اور اس کے طریق کار سے متعلق کچھ شبہات ہوں وہ نوٹ کر کے آج شام تک قیم جماعت کے حوالہ کر دیں تاکہ کل کسی مناسب فرصت میں آپ کے ان شبہات کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک تنبیہ ضروری خیال کرتا ہوں (تنبیہ کا لفظ میں نے اس کے عربی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یہ نہ خیال کیجیے گا کہ غرور کی وجہ سے کوئی بڑا لفظ بول گیا ہوں۔) وہ یہ کہ جو شبہات فی الواقع آپ کے ذہن میں ہوں ان کو پیش کیجیے گا۔ یہ نہ کیجیے گا کہ میرے اعلان کی وجہ سے آپ خواہ مخواہ کچھ شکوک پیدا کرنے کی فکر میں

پڑ جائیں۔ خواہ مخواہ شکوک پیدا کرنا یہ اس عہد کی ایک نئی بیماری ہے، وہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی معقول آدمی اس مرض میں مبتلا ہو۔ کسی امر حق سے متعلق آدمی کے ذہن میں جو سوالات از خود ابھرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سوالات کے حل کرنے میں ایک صاحبِ فکر کی مدد بھی کرتا ہے اور ان سوالات کو حق کی وضاحت کا ذریعہ بھی بناتا ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے دلوں میں شکوک کے کانٹے خود چبھانے کی کوشش کرتے ہیں، جیسا کہ اس زمانہ کے نئے تعلیم یافتہ نوجوان کرتے ہیں، ان کو شک اور حیرانی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور وہ ساری زندگی یقین و ایمان کی لذت سے محروم ہی رہتے ہیں۔ اس وجہ سے میں درخواست کرتا ہوں کہ صرف واقعی شبہات پیش کرنے کی کوشش کیجیے گا۔ میرے اعلان کی وجہ سے نہ مجھے زچ کرنے کی فکر میں پڑ جایئے گا اور نہ خود اپنے آپ کو ایک مرض مہلک میں مبتلا کرنے کی کوشش کیجیے گا۔

اس اجتماع کے بعض پیش نظر کام

اس اجتماع میں جو کام ہمارے پیش نظر ہیں وہ آہستہ آہستہ آپ کے سامنے آجائیں گے، پہلے سے ان سے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک خاص کام جو اس موقع پر ہم کرنا چاہتے ہیں اس کا اعلان اس پہلی ہی نشست میں اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں جن معلومات کی ضرورت ہے وہ بغیر تمام ارکان جماعت کے تعاون کے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اصل کام — جس کے لیے ہم نے تیسرا دن رکھا ہے — سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ وہ آپ کے علم میں آجائے تاکہ وہ بہتر سے بہتر طریق پر انجام پا سکے۔

پچھلے چند سالوں کی مدت میں اللہ تعالیٰ نے ہماری دعوت کے لیے جن لوگوں کے دلوں کو کھولا ہے اگرچہ ان کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہیں ہے کہ بلحاظ کمیت ہم ان کو کچھ اہمیت دیں لیکن جہاں تک ہمیں اندازہ ہے ان کے اندر مختلف قوتیں اور قابلیتیں رکھنے والے اشخاص موجود ہیں جس کی وجہ سے جماعت اپنی کیفیت کے لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ اب ہماری آگے کی اسکیموں کا تقاضا ہے کہ ان قابلیتوں کی تنظیم کی جائے اور مختلف استعداد اور قابلیت رکھنے والے اشخاص کو الگ الگ گروہوں میں تقسیم کرکے اس بات کی کوشش کی جائے کہ ان کو اجتماعی طور پر اپنی اہلیتوں

کو فروغ دینے کا موقع ملے۔ اس طرح کی کوشش کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ جماعت کی جو قابلیت آج وسیع پیمانے پر بکھری ہوئی ہے وہ بہت جلد ایک جگہ جمع ہو سکتی ہے، اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ جب ہم ان قابلیتوں کو جماعت کے پیش نظر مقاصد میں استعمال کرنا چاہیں گے تو نہایت آسانی کے ساتھ استعمال کر سکیں گے۔ نہ اس کو صحیح صحیح وزن کرنے میں کوئی دقت ہوگی، نہ اس کی تنظیم میں کوئی مشکل پیش آئے گی اور نہ ہی یہ بات کچھ ایسی ناممکن ہوگی کہ پوری جماعت کی جدوجہد میں مشترک جدوجہد (Teamwork) کی شان پیدا ہو جائے۔

اس تنظیم کی صورت یہ ہوگی کہ جماعت کے اندر جو لوگ مثلاً طبقۂ علماء سے ہیں ان کا ایک الگ گروپ بنا دیا جائے۔ اسی طرح جو لوگ ارباب قلم ہیں ان کو علیحدہ چھانٹ لیا جائے۔ جو لوگ درس و تعلیم کی قابلیت رکھتے ہیں ان کا علیحدہ گروپ ہو۔ اسی طرح ارباب صنعت و حرفت، اہل زراعت و تجارت، غرض ہر قابلیت کے لوگوں کو الگ الگ کر کے ان کی علیحدہ علیحدہ جماعتیں بنا دی جائیں اور وہ اپنے اندر سے کسی شخص کو منتخب کر لیں جو وقتاً فوقتاً ان کو جمع کر کے ان کے لیے اس قسم کے مواقع بہم پہنچاتا رہے کہ وہ اپنے کام پر جماعتی نقطۂ نظر سے غور کر سکیں۔ اس سلسلہ میں اگر مرکز خود کسی جماعت سے مشورہ لینے یا اس کو مشورہ اور ہدایت دینے کی ضرورت محسوس کرے گا تو اس کو مشورہ لینے یا مشورہ دینے کے لیے بلا سکے گا۔ اس کام کے لیے جو ضروری معلومات مطلوب ہیں اگرچہ اس کا بڑا حصہ ہمارے پاس موجود ہے تاہم ہمارے فہرست اتنی مکمل نہیں ہے کہ ہم تنہا اس کی مدد سے اس کام کو کر سکیں اس وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ یہ سوال کا جواب اس کام کے لیے خاص کریں جو لوگوں کو الگ الگ گروپوں کی شکل میں بلائیں۔ چنانچہ یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ جس گروپ کو بلایا جائے اس سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ آ جائیں، تمام ناموں کو بلانے یا بتانے کا انتظار نہ کریں۔ ہم صرف علماء کے گروپ کے لوگوں کے ناموں کا اعلان کر دیں گے۔

چند باتیں عام حضرات سے اس اجتماع میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہمارے ارکان میں شامل نہیں ہیں گے۔ نہ ہمارے ہمدردوں میں بلکہ عام پبلک سے تعلق رکھتے ہوں گے اور اس جلسہ میں

اس وجہ سے شریک ہوگئے ہوں گے کہ یہ ان کے شہر کے پڑوس میں منعقد ہوا ہے۔ اس طرح کے حضرات سے چند باتیں عرض کردینی ضروری ہیں ورنہ ڈر ہے کہ ان کو کوئی غلط فہمی اور مایوسی ہو۔

میں شروع میں عرض کرچکا ہوں کہ ہمارے یہ اجتماعات وعظ و تقریر کے لیے نہیں ہوتے بلکہ زیادہ تر جماعت کے کاموں کا جائزہ لینے کے لیے ہوتے ہیں۔ ہم اس موقع پر تفصیل کے ساتھ معلوم کرتے ہیں کہ جماعت کی مختلف شاخوں نے سال بھر کے اندر کیا کام کیا ہے۔ ان کے کاموں میں کیا خرابیاں ہیں اور آئندہ کیلیے ان کو کن ہدایات پر عمل کرنا ہے۔ یہ سارے کام ایک جماعت کے کارکنوں کے لیے ضروری بھی ہیں اور بسا اوقات ان کے لیے دلچسپ بھی ہوتے ہیں لیکن ایک غیر شخص کے لیے یہ ساری کارروائی بے مزہ اور خشک اور غیر ضروری ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید اسی طرح کا تجربہ ہمارے اس اجتماع کے عام حاضرین کو بھی ہو اس وجہ سے میں اجتماع کی پہلی ہی نشست میں یہ اعلان کیے دیتا ہوں کہ جو حضرات اس کو ایک عام اصطلاحی جلسہ سمجھ کر آگئے ہوں اور متوقع ہوں کہ یہاں بھی وعظوں اور تقریروں کا زور ہوگا وہ بالکل مایوس ہوجائیں کہ یہاں اس طرح کی کوئی چیز نہ ہوگی۔ نہ وعظ، نہ تقریریں، نہ جلوس، نہ جھنڈے اور نہ جھنڈی کی نمائش۔ ہماری ساری کارروائی بالکل دفتری قسم کی ہوگی۔ جو حضرات اس پر راضی ہوں وہ شوق سے اس میں شریک ہوں۔ ہماری طرف سے یہ بالکل کھلی ہوئی ہے۔ ہم کسی شخص کو بھی اس کی شرکت سے نہیں روکتے۔ لیکن جو حضرات اس میں شریک ہوں اگر وہ اس میں کوئی دلچسپی اور فائدہ اپنے لیے نہ محسوس کریں تو اس بات کی شکایت کا ہم سے ان کو کوئی حق نہ ہوگا۔

عام حضرات کی دلچسپی اور فائدہ کی چیز ہمارا صرف وہ جلسہ عام ہے جو ہفتہ کی شب میں منعقد ہوگا۔ اس میں ہم اپنی دعوت عام لوگوں کے سامنے پیش کریں گے۔ یہ دعوت مسلمان، ہندو، سکھ، پارسی، انگریز، جرمن سب کے لیے یکساں ہوگی۔ اس جلسہ عام میں انشاء اللہ امیر جماعت بھی تقریر کریں گے اور اگر خدانخواستہ وہ زبانی تقریر نہ کرسکے تو ان کی لکھی ہوئی تقریر آپ کو پڑھ کر سنائی جائے گی۔ اس جلسہ میں میں بھی اپنے خیالات پیش کروں گا۔ ہماری تقریریں بھی نہایت سیدھی سادی اور روکھی پھیکی ہوں گی اور وہ لوگ مشکل ہی سے ان میں کوئی بات اپنے مذاق کی پاسکیں گے جن کو اصطلاحی تقریریں

کا چکا ہے۔ اس طرح کے اشخاص کے لیے اس جلسہ کی شرکت کچھ مفید نہ ہوگی۔ البتہ جو لوگ صرف اس بات کا شوق رکھتے ہیں کہ ہماری دعوت کو سمجھیں، خواہ وہ کتنی ہی بے رنگ انداز میں پیش کی جائے تو میں ان کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس جلسۂ عام میں ضرور شریک ہوں۔ انشاء اللہ ان کا یہ مقصد پورا ہوگا۔ اس وقت میرے لیے کسی تقریر کا موقع نہیں ہے تاہم چند باتیں بطور ماحضر پیش کیے دیتا ہوں۔ اس سے کم از کم آپ کو یہ اندازہ تو ہو ہی جائے گا کہ ہم کس طرح کی باتیں کرتے ہیں اور کریں گے اور ان کے سننے کے لیے آپ کا زحمت اٹھانا کچھ نفع بخش ہے یا نہیں؟

حضرات!

ہم جس دعوت کو لے کر اٹھے ہیں اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اس پوری کائنات کا خالق اور رب، مالک اور بادشاہ صرف اللہ رب العالمین ہے۔ اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کائنات پر حکومت کرے اور جس طرح آسمانوں میں اس کا حکم چلتا ہے اسی طرح زمین پر بھی تنہا اسی کا قانون چلے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے اپنی پسند اور ناپسند سے ہم کو باخبر کر دیا ہے اور اس کی مرضی یہ ہے کہ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے ہمارے لیے جو ضابطہ زندگی بھیجا ہے ہم زندگی کے تمام گوشوں میں اسی کی پیروی کریں اور اپنی زندگی میں کسی قسم کی تفریق و تقسیم نہ کریں۔ یعنی یہ نہ کریں کہ زندگی کے کسی حصہ میں تو خدا کی اور اس کے رسولوں کی پیروی کریں اور کسی حصہ میں اپنے نفس کی یا دوسروں کی اطاعت کریں۔ اس قسم کی تفریق و تقسیم شرک ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی طاعت شرک کے ساتھ مقبول نہیں۔

اس دعوت کو ہم خالص عقلی بنیادوں پر پیش کرتے ہیں اور ہمیں اطمینان ہے کہ انسانی عقل کے لیے اس سے زیادہ اپیل کرنے والی بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ہماری یہ دعوت تمام بنی آدم کے لیے یکساں اور عام ہے۔ یہاں تک کہ ہم ان مسلمانوں کے سامنے بھی یہ دعوت پیش کرتے ہیں جو مدعی تو ہیں اسلام کے لیکن خدا کی حاکمیت کے تسلیم کرنے سے ویسے ہی منحرف ہیں جیسی دنیا کی دوسری غیر مسلم قومیں۔ دنیا کی مختلف قوموں کے اندر سے خدا کے جو بندے ہماری اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں اور اس بات پر

آمادہ ہو جاتے ہیں کہ خدا کی اطاعت کے اندر زندگی بسر کریں گے ان لوگوں کی ہم نے ایک جماعت بنائی تاکہ اس نصب العین کی طرف متحدہ اقدام کیا جا سکے جو ہمارے پیش نظر ہے۔

ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم پہلے اس نظام فکر کو درہم برہم کر دینا چاہتے ہیں جس پر دنیا کا موجودہ غلط نظام زندگی قائم ہے اور اس کی جگہ اس نظام فکر کو دلوں کے اندر راسخ کرنا چاہتے ہیں جس پر صحیح نظام زندگی کی بنیادیں قائم کی جا سکتی ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ایک صحیح نظام زندگی کے لیے جو بہترین بنیادیں اسلام فراہم کرتا ہے وہ کوئی اور مذہب نہیں فراہم کرتا اس وجہ سے ہم اسلام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور تمام انسانوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ ان کو جو تعصب ہے اس کو وہ اسلام کے خلاف نہ استعمال کریں بلکہ اسلام کی تعلیمات پر مجرد ان کی صفات (merits) کی روشنی میں غور کریں۔ اگر انھوں نے اس طرح اسلام پر غور کیا تو آج جو مسائل دنیا کو پریشان کیے ہوئے ہیں اور جن کا کوئی حل نہیں مل رہا ہے وہ سارے مسائل بہتر سے بہتر طریق پر حل ہو جائیں گے۔

اس کام کو لوگ بہت مشکل بلکہ ناممکن قرار دیتے ہیں لیکن ہم بہت پر امید ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ کام صحیح طور پر کیا گیا تو جو امکانات آج اس کی کامیابی کے ہیں اور کسی کام کے لیے نہیں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آج پورے کرۂ زمین پر بالشت بھر جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں بالفعل وہ نظام حق برپا ہو جس کی ہم تمنا رکھتے ہیں لیکن ہمیں زمین کا حال دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ دلوں کے اندر اس نظام زندگی کے قبول کرنے کی جو عزت موجود ہے وہ کسی اور نظام زندگی کے لیے نہ ہے نہ ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس کے صحیح طور پر پیش کرنے والے لوگ پیدا ہو جائیں۔ اس وجہ سے ہم زمین کے بجائے دلوں کو ٹٹول رہے ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ جس دل میں ہماری دعوت جاگزیں ہو جائے گی اس کا نور جہاں تک پھیلے گا وہاں تک کی زمین بھی نورانی ہو کے رہے گی۔

اس وقت دنیا کی عام ذہنی حالت میں جو ہلچل برپا ہے وہ بھی اس کام کے لیے نہایت ہی سازگار ہے۔ جہاں تک تقلید کا تعلق ہے دنیا اس کی بندشوں سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو چکی ہے۔ اب لوگ کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دیکھنے اور سننے لگے ہیں۔ زندگی کے متعلق تمام متبدل عام نظریے امتحان کی کسوٹی پر ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ وہ لوگ پرانے جامے اتار کر کسی نئے جامہ کے لیے منتظر ہیں جو ان کی قامت پر راست آ جائے۔ مختلف جماعتیں دنیا کی اس طلب کو پوری کرنے کے لیے آگے بڑھ رہی ہیں مگر ایسا اسلام ہے جس کو پیش کرنے کی ہمت کرنے والے لوگ موجود نہیں ہیں حالانکہ دنیا کو آج جو بے قراری لاحق ہے وہ اسلام کے سوا کسی اور چیز سے دور نہیں ہو سکتی۔ اسی خلا کو ہم بھرنا چاہتے ہیں دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کا اہل بنائے۔

اجتماع الٰہ آباد میں اختتامی تقریر (۲)

(از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی)

حضرات! اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ فضل و احسان ہے کہ ہمارے اجتماع عام کی کارروائی اپنی آخری منزل میں پہنچ گئی۔ اب صرف شب کا جلسۂ عام باقی رہ گیا ہے اور کل گرپس (Groups) والی تجویز کی تکمیل کرنی ہے۔ ہم سب کو اس بات کا افسوس ہے کہ ان تمام مراحل میں ہم امیر جماعت کی رہنمائی سے، ان کی بیماری کی وجہ سے، محروم رہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و قوت دے کر وہ شب کے جلسہ عام میں شرکت کر سکیں۔

حضرات! جس طرح آپ کے اجتماعات کی ظاہری شکل و صورت دوسرے اجتماعات سے مختلف ہوتی ہے اسی طرح ان کا باطن بھی دوسرے اجتماعات کے باطن سے بالکل مختلف ہے مجھے امید ہے کہ آپ کو اس کے ظاہری ہنگاموں نے اس قدر مشغول نہ رکھا ہوگا کہ آپ کو اس کے باطن کی طرف توجہ کرنے کا سرے سے موقع ہی نہ ملا ہو۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ آپ کا یہاں آنا آپ کے لیے مفید ہوا ہوگا۔ آپ نے اپنے مقصد میں بصیرت حاصل کی ہوگی اور اس کے لیے آپ میں نئی ہمت اور تازہ سرگرمی پیدا ہوئی ہوگی۔ اگر خدانخواستہ اس طرح کی کوئی بات نہ پیدا ہوئی ہو اور آپ محض محنت اور تکان کا اثر یہاں سے لے کر واپس جا رہے ہوں تو گھر جا کر اپنا اچھی طرح جائزہ لے کر ہمیں اطلاع دیجیے کہ ہم بالکل خالی ہاتھ واپس آئے تاکہ ہم غور کر سکیں کہ یہ محرومی کس کی غلطی کا نتیجہ ہے؟ آپ کی یا ہماری؟ یا دونوں کی؟ اور آئندہ کے لیے اس کی اصلاح کی کوشش کی جائے۔ جس طرح آپ کی پیش کی ہوئی رپورٹوں سے ہم نے اپنے کاموں کی رفتار معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اسی طرح آپ کی اطلاعات سے ہم اپنے ان اجتماعات کی افادیت کا اندازہ

کرنا چاہتے ہیں تاکہ وقت اور مال کی بربادی سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ اور یہ اجتماعات محض رسمی چیز بن کے نہ رہ جائیں بلکہ ان سے وہ مقصد حاصل ہو جن کو پیشِ نظر رکھ کر یہ منعقد کیے جاتے ہیں۔

مجھے اس موقع پر آپ سے بہت سی باتیں کہنی تھیں لیکن افسوس ہے کہ وقت بہت کم ہے اس وجہ سے محض چند باتوں کی طرف اشارہ کرکے اپنا بیان ختم کردوں گا۔

میں اس وقت جماعت اسلامی کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کروں گا لیکن ان خصوصیات کے بیان کرنے سے مقصود یہ نہیں ہے کہ یہ بالفعل جماعت کے ارکان کے اندر موجود ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ آپ کے اندر ہونی چاہئیں، اور آپ کا فرض ہے کہ آپ برابر اپنا جائزہ لے کر دیکھتے رہیں کہ یہ آپ کے اندر موجود ہیں یا نہیں اور اگر موجود ہیں تو کس حد تک؟ اور انہی کو آپ جماعت کے ساتھ وابستگی کے لیے معیار بنائیے۔ اگر یہ خصوصیات پورے طور پر موجود ہیں تو سمجھیے کہ جماعت کے ساتھ آپ کی وابستگی پوری ہے اور اگر ناقص طور پر موجود ہیں تو سمجھیے کہ جماعت کے ساتھ آپ کا تعلق بھی ادھورا ہے اور اگر سرے سے موجود ہی نہیں ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ جماعت کے ساتھ آپ کی وابستگی محض رسمی و ظاہری ہے۔ حقیقت سے اس کو کچھ تعلق نہیں۔

۱۔ ان خصوصیات میں سب سے مقدم خصوصیت یہ ہے کہ موجودہ ماحول کے اندر آپ غربت کا احساس کریں۔ غربت سے میرا مقصد مال و اسباب کی کمی نہیں ہے۔ اس چیز کا احساس تو ایک مسلمان اگر وہ سچا مسلمان ہے، کبھی کرتا ہی نہیں۔ غربت سے میرا مقصد یہ ہے کہ موجودہ فضا میں آپ کو ہر جگہ اجنبیت کا احساس ہو۔ خاندان میں، سوسائٹی میں، قوم میں آپ کو اپنے ہمدرد، دوست، اور ہم خیال و ہم مشرب بہت کم نظر آئیں۔ آپ کو ہر مجلس میں احساس ہو کہ آپ جو کچھ چاہتے ہیں دوسروں کی چاہت اس سے مختلف ہے، آپ جو کچھ سوچتے ہیں دوسروں کا فکر اس سے بالکل الگ ہے۔ آپ کا مذاق، آپ کا رجحان، آپ کا خیال اور آپ کا ارادہ ہر چیز دوسروں کے مذاق، رجحان اور خیال و ارادہ سے متباین بلکہ متصادم نظر آئے۔ آپ کو ایسا محسوس ہو کہ آپ خشکی کی مخلوق ہیں اور آپ کو سمندر میں ڈال دیا گیا ہے یا آپ سمندر کے جانور ہیں اور آپ کو خشکی میں پھینک دیا گیا ہے۔ دوسروں کو اپنی کامیابی کی راہیں

بہت فراخ نظر آ رہی ہوں مگر آپ کو اپنی کامیابی کی راہ رُندھی ہوئی ملے۔ دوسرے جس راہ پر چل رہے ہوں وہ قافلوں سے بھری ہوئی ہو مگر آپ کو ہر راہ میں قلتِ اعوان و انصار سے سابقہ پڑے۔ دوسروں کے لیے وسائلِ زندگی کے انبار لگے ہوئے ہوں مگر آپ کو سدرمق کے چند خشک نوالے حاصل کرنے کے لیے بھی ایڑی کا پسینہ چوٹی تک پہنچانا پڑے۔ جب آپ موجودہ دنیا میں اس طرح اپنے آپ کو مشکلات کے شکنجوں میں کس ہوا پائیں اور آپ کے قریب سے قریب اعزہ بھی ان مشکلات کے حل کرنے میں آپ کی کوئی مدد نہ کریں بلکہ الٹے ان میں اور زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کریں تب آپ سمجھیے کہ جماعت اسلامی کے مقاصد کا سچا شعور آپ کے اندر پیدا ہو گیا ہے اور اس کی علامتیں آپ کے ظاہر و باطن دونوں میں اچھی طرح ابھر رہی ہیں۔ اور اگر یہ باتیں نہ پائی جائیں بلکہ جماعت اسلامی میں داخل ہونے کے بعد بھی اس ماحول کے ساتھ آپ کی سازگاری اور موافقت اسی طرح باقی رہے جیسی جماعت میں داخل ہونے سے پہلے تھی اور آپ کے پھیلے ہوئے تعلقات کے کسی گوشہ میں کوئی رخنہ اور خلل نہیں پیدا ہوا ہے، آپ کے احباب بدستور آپ سے خوش اور آپ کے اقربا جب سابق آپ سے راضی ہیں، آپ کے معاش اور معیشت کی ساری راہیں پہلے کی طرح اب بھی کھلی ہوئی ہیں اور کسی جہت سے آپ اجنبیت اور بیگانگی کا احساس نہیں کر رہے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے جماعت اسلامی کا صرف لیبل اپنے اوپر لگا لیا ہے۔ اس کی حقیقت آپ کے دل کے اندر نہیں اتری ہے۔

اس چیز کو آپ جماعت کے ساتھ اپنی وابستگی کو جاننے کے لیے کسوٹی قرار دیجیے۔ اور آپ میں سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر خود اپنا اندازہ کر کے فیصلہ کر لے کہ جماعت کے ساتھ اس کا تعلق حقیقی ہے یا محض تاجرانہ۔ ہم جن لوگوں کی تلاش میں ہیں وہ پہلی قسم کے لوگ ہیں نہ کہ دوسری قسم کے لوگ۔ وہی لوگ ہیں جن کے لیے حدیث میں مبارکی دی گئی ہے اور جن کی نسبت حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "وہی ہیں جو میرے بعد کے بگاڑ کی اصلاح کریں گے۔"

۲۔ دوسری خصوصیت جو مطلوب ہے اور جو درحقیقت پہلی خصوصیت ہی کا لازمی نتیجہ ہے،

یہ ہے کہ آپ اپنی ساری وابستگی اور دلچسپی ان لوگوں کے ساتھ بڑھائیں جو اصول و مقاصد میں آپ کے ساتھ متحد ہوں۔ اگر ان کی تعداد کم ہو تو اس کی پروا نہ کیجیے انہی کی رفاقت اور نصرت کی قدر کیجیے۔ اگرچہ وہ آپ کے عزیز نہ ہوں لیکن آپ ان کو عزیزوں سے بڑھ کر عزیز رکھیے۔ اگرچہ وہ آپ کی قوم سے باہر کے ہوں لیکن آپ کی عصبیت و حمیت ان کے لیے اپنی قوم سے بھی زیادہ ہو۔ اگرچہ وہ ہمیشہ سے آپ کے اور آپ کی قوم کے دشمن رہے ہوں لیکن آج اگر انھوں نے اس حق کو قبول کر لیا ہے جس حق کو آپ نے قبول کیا ہے تو آپ کی طرف سے ان کے لیے صرف یہی دوستی ہی ہونی چاہیے۔ آپ ہر طرف سے کٹ کر اپنی ساری دلچسپیاں صرف ان کے اندر ڈھونڈیے۔ یہی آپ کے عزیز ہوں یہی آپ کے دوست ہوں۔ یہی آپ کے غمخوار ہوں۔ ان کے سوا دوسروں کے ساتھ آپ کا تعلق دوستی اور محبت کا نہ ہو بلکہ صرف خیر خواہی اور خیر سگالی کا ہو یعنی آپ ان کو بھی اس حق سے آشنا کیجیے جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر کھولا ہے۔

آپ کا گھرانا اہل حق اور اہل ایمان کا گھرانا ہو۔ جن کا رشتہ حق کے ساتھ جتنا ہی ضعیف ہو آپ کا رشتہ ان کے ساتھ اتنا ہی ضعیف ہونا چاہیے اور جن کا رشتہ ایمان کے ساتھ جتنا ہی مضبوط ہو آپ کا رشتہ ان کے ساتھ اتنا ہی مضبوط ہونا چاہیے۔ اس اصول کو سامنے رکھ کر اپنی دوستیوں اور دشمنیوں کا پورا جائزہ لیجیے اور اگر کہیں آپ کو نظر آئے کہ آپ دوستی کے مستحق کے ساتھ دشمنی اور دشمنی کے حقدار کے ساتھ دوستی کا معاملہ کر رہے ہیں تو اللہ کے ڈر سے اس کی اصلاح کیجیے۔ اگر آپ ایک اصول کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں تو اس کے دشمنوں کے ساتھ آپ کی دوستی نہیں ہو سکتی اس طرح جو لوگ اس اصول سے دوستی رکھتے ہیں ان کے ساتھ آپ کی دشمنی بھی خلاف فطرت ہے۔ آپ نسل و نسب کے بت کے پجاری نہیں ہیں اور نہ آپ کو رنگ و خون کے امتیازات ہی سے کوئی دلچسپی ہے۔ آپ کی نفرت و محبت تو تمام تر اللہ اور رسول کے تعلق کے تابع ہے۔ جو لوگ اللہ و رسول کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لیں آپ ان کے بن گئے اور وہ آپ کے بن گئے۔ آپ کا اور ان کا رشتہ مادی رشتہ ہے، اخلاقی رشتہ ہے اور روحانی رشتہ ہے۔ یہی معنی ہیں رحماء بینھم کے۔ اگر ایمان و اسلام

کے رشتہ کے سوا کوئی اور رشتہ بھی آپ نے باقی رکھ چھوڑا ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کیجیے اور جلد سے جلد اس کو حق کے تابع کیجیے۔ نہیں معلوم کب آپ کے سامنے آزمائش کی گھڑی آجائے اور وہ آپ سے مطالبہ کرے کہ حق کے لیے چچا بھتیجے کی گردن پر تلوار چلائے اور بھانجہ ماموں کے سینہ پر نیزہ مارے۔

باطل اور باطل کے تمام رشتوں سے قلبی انقطاع اصلی روحانی ہجرت ہے جس کا آغاز اس دن سے ہوجاتا ہے جس دن ایک بندۂ حق ایک حق کو قبول کرتا اور اس کی خاطر ایک باطل کو چھوڑتا ہے۔ آپ اس روحانی ہجرت کا عزم کیجیے اور اس راہ میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں اس پر تابڑ توڑ مشق بہم پہنچایئے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے پہلے سے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا وہ حق کے لیے بڑی سے بڑی قربانی بھی پیش کردیں گے اور عزیز سے عزیز تعلقات پر مقراض بھی چلادیں گے۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ آزمائش کی گھڑیوں میں قلب و دماغ کی صرف وہی قوت کام دیتی ہے جو بالفعل موجود ہو اور جس کا ذخیرہ پہلے سے فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ جو لوگ اپنی فوج کو اس وقت ٹریننگ دیتے ہیں جب دشمن نے حملہ کردیا ہو ان کے حصہ میں ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

۳۔ تیسری صفت جو آپ کو اپنے اندر پیدا کرنی ہے وہ اس کی مقابل صفت ہے یعنی یہ کہ جو لوگ اصول اور مقصد میں آپ سے مختلف ہوں وہ آپ کو نرم چارہ نہ پائیں۔ وہ جب آپ کو ٹٹولیں تو انھیں محسوس ہو کہ ان کے لیے آپ کے اندر انگلی دھنسانے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ اپنے اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے آپ کو آلۂ کار نہ بنا سکیں۔ پہلی جماعت کے لیے آپ جتنے سادہ لوح، کرم النفس اور بھولے بھالے ہوں دوسری جماعت کے لیے آپ کو اسی قدر ہوشیار، بیدار مغز اور اصول پرست ہونا چاہیے۔ ان کو آپ ہرگز اس بات کا موقع نہ دیں کہ وہ آپ پر اپنا رنگ چڑھادیں اور آپ کو اپنے سانچہ میں ڈھال لیں۔ جب تک آپ میں یہ صفت نہ پیدا ہو اس وقت تک نہ آپ کے اندر جماعت اسلامی کے مقاصد کا صحیح شعور پیدا ہوا ہے اور نہ آپ میں وہ سیرت پیدا ہوئی ہے جو جماعت اسلامی کے پیش نظر مقاصد کی تکمیل کے لیے مطلوب ہے۔ قرآن مجید اہل ایمان کی جو تعریف کی گئی ہے کہ وہ اشداء

علی الکفار ، کفار پر سخت ہیں اس کے معنی یہی ہیں۔ جو لوگ اللہ کی فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں ان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ دشمن کے بگل بھی لفٹ رائٹ شروع کر دیں اور عارضی فوائد کے لیے اس کا کلمہ بلند کر دینے اور اس کی لڑائی لڑ دینے میں بھی کوئی ہرج نہ خیال کریں۔ جو لوگ حق اور باطل دونوں کے ساتھ رشتہ رکھنا چاہتے ہیں ان کا رشتہ صرف باطل کے ساتھ رہتا ہے۔ حق اس قسم کی شرکت اور آلودگی کو گوارا نہیں کرتا۔ آپ کی سیرت کی وہ ساری کمزوریاں جو آپ کے اندر باطل کو گھسنے کی راہ دیتی ہیں آپ کے ضعف ایمان کی دلیل ہیں اور اب جس زندگی کا آپ نے آغاز کیا ہے اس کا اولین تقاضا ہے کہ آپ ان کمزوریوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کیجیے۔

یہ دو تین باتیں میں نے آپ کے سامنے کسوٹی کی حیثیت سے پیش کی ہیں۔ آپ ان کے اوپر اپنے آپ کو جانچ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ جماعت کے ساتھ آپ کا تعلق کس نوعیت کا ہے؟ محض زبان سے آپ اس کے ساتھ ہو گئے ہیں اور دل آپ کا انہی کوچوں میں ابھی آوارہ گردی کر رہا ہے جن میں پہلے آوارہ گردی کر رہا تھا یا آپ دل اور زبان دونوں سے اس کے ساتھ ہیں۔

حضرات! میں آپ کو رخصت کرنے سے پہلے کچھ زادِ راہ بھی آپ کو دینا چاہتا ہوں۔ یہ زادِ راہ آپ کے راستہ میں بھی کام آئے گا، گھر پر بھی کام دے گا اور اگر آپ نے اسکی قدر کی تو یہ زندگی کے ہر مرحلہ میں آپ کے کام آئیگا۔ یہ زادِ راہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی یاد! مجھ پر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی حدیثوں سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ تمام طاقت وقوت کا خزانہ اللہ کی یاد ہے۔ پس آپ کا دل اسکی یاد سے کبھی خالی نہ رہنا چاہیے۔ اللہ کی یاد سے میری مراد ذکر اور فکر دونوں ہے۔ میں مجرد اس ذکر کی دعوت نہیں دے رہا ہوں جو محض وظیفۂ زبان بن کے رہ جائے دل ودماغ سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس طرح کا ذکر کچھ مفید نہیں ہے۔ نیز میں صرف قولی ذکر کی دعوت نہیں دے رہا ہوں، میرے نزدیک اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی ہر جدوجہد ذکر الٰہی میں داخل ہے بلکہ حقیقی ذکر یہی ہے۔ آپ اس ذکر کا اہتمام کیجیے۔ آپ کے سامنے جو مرحلے آ رہے ہیں، ان میں یہی چیز کام دے گی۔ اسی سے ہر مشکل آسان ہو گی۔

اب میں اس اجتماع کی کارروائی کو دعا پر ختم کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھکو اور آپ کو حق کی معرفت بخشے اور اس کی خدمت کے لیے ہمت و استقامت عطا فرمائے۔

فسادات کے بارے میں چند اہم معلومات

(از جناب نعیم صدیقی)

ہندوستان میں خدا ناشناس اور بے اخلاق سیاست کے پھلنے پھولنے سے فتنہ و فساد کی جو آگ ملک کے گوشے گوشے میں بھڑک اٹھی ہے، اس کی روک تھام اور اس کے مقابلے کے لیے جماعت اسلامی نے اپنے ارکین اور ہمدردوں سے انتہائی جدوجہد کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ ہمارے رفقا کو میدان عمل میں آنے کی وجہ سے فسادات کے سلسلہ میں بہت ہی اہم اور قابل وثوق معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ یہ معلومات بحالی امن کی مساعی کو آگے بڑھانے میں بہت کارگر ثابت ہوں گی۔ پس یہ ضروری ہے کہ ان معلومات کو جمع کیا جائے اور ان کا جوہر نکال کر رفقا کے سامنے رکھا جائے۔

ہمارے ملک کے فسادات وبائی نوعیت کے نہیں ہیں، بلکہ یہ ہماری ہیئت اجتماعی کی مستقل باطنی خرابیوں کے ظہورات ہیں، اور مستقل خرابیاں اگر برقرار رہیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ وحشت و بربریت کا یہ طوفان کب تھمے گا۔ ان حالات میں ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے وفادار بندے اور اخلاق اسلامی کا سچا احترام کرنے والے صالحین مسلم اور غیر مسلم دونوں گروہوں کو ان آفات سے بچانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور بالکل سپاہی بن کر اٹھ کھڑے ہوں۔ اپنا مال اور اپنا وقت اور اپنی قوتیں اور صلاحیتیں بالکل یکسو ہو کر خدمت انسانیت کی راہ میں صرف کرنے کا فیصلہ کر لیں۔ جس طرح فسادی عناصر نے اپنے قویٰ کو فساد پھیلانے میں صرف کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ ہماری ذمہ داریاں نہ صرف اپنے اصول و مسلک کی وجہ سے شدید ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی اہمیت رکھتی ہیں کہ کوئی دوسرا منظم گروہ اس ملک میں ایسا نہیں ہے جو فساد کو روکنے اور امن قائم کرنے کے لیے اخلاص اور یکسوئی کے ساتھ میدان عمل میں آ سکے۔

جو لوگ فساد کو روکنے اور امن کو قائم کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھانا چاہیں، ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ

وہ گردوپیش کے فسادات کی حقیقی علت کو معلوم کریں اور پورا زور اس علت کو دور کرنے پر صرف کریں، یا اگر فوری وجوہ انھیں فسادات کے بعض خارجی مظاہر پر متوجہ بھی کر دیں تو بھی وہ ان کے داخلی اسباب سے پوری طرح قطع نظر نہ کر لیں۔ علاوہ بریں فسادات کے فریقین کی پیشوائی حقیقۃً جس گروہ کے ہاتھوں میں ہو اسے پہچانیں اور اس کو یہ پوزیشن جن وجوہ سے حاصل ہوئی ہو ان کا تعین کریں۔ پھر اس سے زیادہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ فساد کی نفسیات کیا ہوتی ہیں اور ذہن کی مشینری کے کونسے پرزے بربریت کا آغاز کرنے والے ہوتے ہیں اور بربریت کے ابھر آنے پر نفس انسانی کے کونسے حصص مفلوج ہو جاتے ہیں۔ پھر اس سے آگے اس پھیلانے والے ہر سپاہی کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ فسادات کی بارود کیسے بجھا کرتی ہے اور یہ بھی کہ اس بارود کو بھک سے اڑانے کے لیے چنگاریاں کیا ہوتی ہیں؟ الغرض فسادات کی روک تھام کرنے کے لیے محض خلوص اور جوش عمل کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ حکمت وبصیرت کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ترجمان القرآن کے اشارات میں اہم معلومات اور اصولی ہدایات مسلسل پیش کی جا رہی ہیں اور آئندہ بھی بقدر ضرورت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ نیچے کی سطور میں راقم الحروف چند ایسے اہم امور کا تذکرہ کر رہا ہے جو فسادات کا مطالعہ کرنے کے بعد ذہن کے سامنے آئے ہیں۔ ان امور کے معلوم ہونے سے رفقا کو ان شاء اللہ اپنے کام میں مدد ملے گی۔

(۱) عام طور پر فساد زدہ علاقوں کے احوال کا جائزہ لیتے ہوئے ہم نے محسوس کیا ہے کہ جہاں تک عوام کی ذہنیت کا تعلق ہے، ان کے اندر کہیں بھی فتنہ و فساد کی خواہش نہیں پائی جاتی، بلکہ ان کی فطرت سلیم ہر جگہ بربریت سے ابا کرنے والی ہے۔ فساد پھوٹ پڑنے سے پہلے ان کے ضمیروں کو جہاں ٹٹولا گیا وہاں بھی یہی محسوس ہوا کہ ان میں فساد کے ذوق کے بجائے فساد کا خوف پایا جاتا ہے، اور فساد کا طوفان گذر جانے کے بعد جہاں کہیں ان کی نفسیات کا جائزہ لیا گیا، وہاں بھی یہی اندازہ ہوا کہ ان کو فساد سے نفرت ہے۔ دوسری طرف اونچے سمجھدار طبقہ کے افراد کے بارے میں بھی یہی معلوم ہوا کہ ظہور فساد انھیں بھی مرغوب نہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ فساد پھوٹتا کیوں کر ہے جبکہ خواص اور عوام دونوں اسے پسند کرتے تھے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں گروہوں میں ایک ایسا شر انگیز عنصر پایا جاتا ہے جس میں شاید کچھ تو یوں بھی ذوقِ جرائم موجود ہے اور اس کے ساتھ ساتھ فسادات میں لوٹ کے جو وسیع مواقع ہوتے ہیں وہ بھی اس کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ یہ دونوں محرکات اس عنصر کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ فتنہ انگیزی کرے۔ چنانچہ فساد کی ابتدا کرنے تک تو یہ عنصر بالکل Back Ground میں رہتا ہے اور نہایت دبیز پردہ و نفسیاتی ہتھکنڈوں سے فضا کو مشتعل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے جاننا اور اس کی کارروائیوں کو سمجھنا عوام تو کیا، خواص تک کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن جب فساد پھوٹ پڑتا ہے تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کی وجہ سے یہ عنصر یا تو خود بڑھ کر قیادت کے منصب کو سنبھال لیتا ہے یا عوام الناس مجبور ہو کر اسے آگے کرتے ہیں اور پھر حالات کی ساری مشین اسی عنصر کے قابو میں آجاتی ہے اور سوسائٹی کے اکابر اور اشراف تک اس کے آگے دم نہیں مار سکتے۔

اشتعال انگیزی کے لیے مختلف وجوہ گھڑنا، ایک فریق کو دوسرے سے ہراس دلانا اور اس کی تیاریوں کے متعلق مبالغہ آمیز اطلاعات فراہم کرنا، اپنی قوم کے لوگوں کو بزدلی کے طعنے دینا، دوسری قوم کے لوگوں کی جسارتوں پر تقریریں کرنا، اور جب آخری وقت آجائے تو نتیجہ خیز افواہوں کا پھیلانا اس طبقہ اشرار کے مخصوص فنونِ لطیفہ ہیں۔

بعض مواقع کے متعلق ہمیں یہاں تک معلوم ہوا ہے کہ صرف نو یا دس آدمی کسی علاقے کو آگ لگا کر جان و مال کی بے تحاشا بربادی کا موجب بنے اور اس کمال فن کے ساتھ کہ وہ کبھی سامنے نہ آئے۔ نہ فساد کی لپیٹ میں آنے والے خواص و عوام کو ان سے کوئی وسیع تعارف ہی ہو سکا۔ ان لوگوں نے جہاں ضروری سمجھا رقعے اور سرکلر جاری کر کے عوام کو مشتعل کرنے کے لیے منظم کیا۔ پھر اگر کہیں فساد کے پھوٹ پڑنے میں دیر ہوتی محسوس کی تو بے تاب ہو کر خود اپنی کسی عبادت گاہ کو یا اپنی قوم کے کسی فرد کے گھر کو، بلکہ یہاں تک کہ خود اپنے ہی گھر کو آگ لگانے کی کوشش کی اور نتیجۃً اپنی قوم کو یا اغیار کو مشتعل کر لیا۔ پھر اسی عنصر کی قیادت فساد کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ بربریت کے ہنگاموں میں چوروں اور ڈاکوؤں تک کا اخلاق برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ بلکہ

انسانوں کے انبوہ چیتوں اور ریچھوں کی سطح پر جا پہنچے ہیں۔

فسادی روک تھام کرنے والے کارکنوں کے لیے اپنے اپنے ماحول میں اس خاص عنصر کو اور اس کی مخصوص حرکات کو خوب اچھی طرح پہچان لینا ضروری ہے، تاکہ عوام الناس کو اس کے شر سے خبردار کیا جا سکے۔

(۶) فسادزدہ مقامات کا جائزہ لینے سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ قریباً ہر جگہ طوفان وحشت کا آغاز افواہوں سے ہوا ــــ اور افواہوں کے "کارخانوں" کے صناع ہر جگہ ایسے ماہرین فن تھے، جنھوں نے عوام کی نفسیات کو پوری طرح ٹٹول کر بالکل ایسی افواہیں وضع کیں جن کو سننے کے بعد، صبر و تحمل اور غور و فکر سے کام لینا کم از کم سادہ لوح عوام کے لیے بالکل ممکن نہ تھا، اور افواہوں کی یہ اشتعال انگیزی ایسی قیامت انگیز تھی کہ اس کی روک تھام سیاست کی سطحی تماشتی تنظیم کے بس میں نہ تھی۔

تصادم اور جنگ کی فضا میں قرآن نے افواہ کو جتنا خطرناک قرار دیا ہے اور اسے گھڑنے اور پھیلانے والوں کو جس درجہ کا مجرم گردانا ہے، اس پر مجملاً ایمان تو تھا ہی، مگر اب اس ذہنی چنگاری کی آتش افروزیوں کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر صحیح اندازہ ہوا ہے کہ جماعت اور سوسائٹی کے لیے نازک مواقع پر افواہ کتنی تباہ کن ہوتی ہے۔ اس شیطانی چنگاری کی زد سے خرمن امن کو بچانے کے لیے قرآن ہی کی بتائی ہوئی تدابیر نتیجہ خیز ہو سکتی ہیں۔ ان تدابیر میں سے ایک تو یہ ہے کہ عوام کو یہ سکھایا جائے کہ وہ ہر خبر لانے والے کو اس پر مجبور کریں کہ وہ محلے یا گاؤں یا شہر کے اکابر کو براہ راست مطلع کرے اور بطور خود اسے پھیلاتا نہ پھرے، دوسری ضروری تدبیر یہ ہے کہ ہر خبر کے نہ صرف سلسلہ روایت کو پوری طرح معلوم کیا جائے، بلکہ قرائن و شواہد کی روشنی میں اس کی صحت اور عدم صحت کا فیصلہ پورے غور و فکر سے کیا جائے، بلکہ بالعموم مناسب یہ ہوتا ہے کہ موقع پر کسی ثقہ آدمی کو بھیج کر یا ذریعے ثانی کے اکابر سے تحقیق کر کے واقعات کو معلوم کر لیا جائے۔ تیسری ضروری تدبیر یہ ہے کہ کسی خبر یا افواہ پر عوام میں از خود کوئی کارروائی شروع کر دینے کی جو عادت ہوتی ہے، اسے روکنے کی پوری سعی کرنی چاہیے اور انھیں سکھانا چاہیے کہ وہ اپنے اکابر کے فیصلہ کا انتظار کریں اور اس پر عمل کریں۔[1]

---

[1] ان تدابیر کو اس وقت تک پوری طرح عمل میں لانا اور ان سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے، جب تک کہ ایک اعلیٰ درجہ کی تنظیم رونما نہ ہو جائے جس کی بنیاد قلوب کی راستی اور ان کے جوڑ میل پر ہو۔ اور یہ چیز صرف بندگی رب سے پیدا ہوتی ہے، تاہم اس کے پیدا ہونے سے پہلے ان تدابیر سے جتنا استفادہ کیا جا سکتا ہے کرنا چاہیے۔

(۳) ایک عجیب تجربات ہمارے علم میں یہ آئی ہے کہ بعض مواقع پر فتنہ انگیزی کی پہل اس کمزور اور قلیل التعداد فریق کی طرف سے ہوئی ہے جس کی جیت کا ماحول کے لحاظ سے کوئی امکان نہ تھا۔ ہوا یوں کہ کمزور فریق میں خوف کا جو جذبہ برسرِ عمل تھا، اس نے اس کے افراد کو تشویش میں اور بدگمانیوں میں مبتلا کیا ہے، پھر اس کے ساتھ ساتھ اس میں تقدم کی تیاریوں کا آغاز ہوا ہے، پھر ان تیاریوں کی نمائش ہوتی رہی ہے، پھر اس نمائش کے ساتھ جذبۂ خوف نے تہور کی شکل اختیار کی ہے، اور تہور کے مظاہرات ہی سے کمزور فریق نے پہل کی ہے اور "آبیل مجھے مار" کے اصول پر قوی فریق کے ہاتھوں اپنے آپ کو تباہ کرالیا ہے۔

خود اکثریت رکھنے والے قوی فریق نے جہاں کہیں پہل کی ہے، اس میں بھی فتنہ انگیز عنصر نے پہلے خوف و ہراس کو ابھارا ہے اور اقلیت کی خفیہ جنگی تیاریوں کا (جو ایک حد تک واقعی تھیں) اتنا چرچا کیا ہے کہ عوام خوف زدہ ہو کر متہور ہوگئے ہیں۔

ایسے حالات جہاں کہیں پائے جائیں، وہاں فوراً کارکنانِ امن کو خوف کے وقتی ابھار کو دور کرنے کی سعی کرنی چاہیے اور تقافل کر کے اسے تہور کی شکل اختیار کرنے کا موقع نہ دینا چاہیے۔

(۴) فساد زدہ علاقوں کے عین بیچ میں گھرے ہوئے یا ان کے ملحق دیہات اور قصبات یا فساد زدہ شہروں اور قصبوں کے بعض مخصوص محلے بالکل اس طرح بچ کر رہ گئے ہیں، جیسے کسی طوفانی سمندر کے درمیان جزیرے پورے سکون سے اپنی جگہ پر جمے رہتے ہیں۔ ایسی جگہوں کے احوال کی کرید کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں کے ذی اثر اکابر نے بالعموم دنیوی مصلحتوں سے اور شاذ و نادر خدا ترسی اور اخلاقی احساس کے تحت امن قائم رکھنے کی واقعی شدید سعی کی ہے اور کامیاب ہوئے ہیں۔ ایسے مقامات کے احوال کو فساد زدہ مقامات کے احوال کے مقابلہ میں رکھ کر یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ جس جگہ اربابِ اثر خلوص و عزم کے ساتھ امن کو بچانے کے لیے ڈٹ گئے ہیں، وہاں بیرونی فسادیوں کے ہجوم کئی کئی بار منڈلا منڈلا کر لوٹ جانے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ذی اثر لوگ اگر بدنیتی اور بزدلی کا شکار نہ ہوجائیں تو تباہی کے سیلاب کو روکنے میں یہ کتنے کارآمد ثابت ہوسکتے ہیں۔ اور اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ فسادات کو روکنے کے لیے یا فساد زدہ علاقوں میں امن پھیلانے کے لیے عوام کو متاثر کرنے

سے زیادہ ضروری اور زیادہ مفید صورت یہی ہے کہ اکابر کو متاثر کیا جائے۔ دونوں فریقوں کے سرخیل اگر بلاک بناکر مفسدین کے مقابلہ میں کھڑے ہوجائیں تو بڑے سے بڑا طوفان تھم کے رہ جاتا ہے اور یہ سرخیل حضرات ہی اگر بدنیت اور بزدل ہو کے مفسدین کو کام کرنے کا موقع دے دیں یا ان کی مدد پر راضی ہوجائیں تو پھر امن و سکون کو بچانا ممکن نہیں رہتا۔

یہی حقیقت تھی جسے قرآن نے یوں بیان کیا کہ واذا اردنا ان نهلك قرية امرنا مترفيها ففسقوا فيها فحق عليها القول فدمرناها تدميرا ہ

پس ناگزیر ہے کہ کسی مقام کے ارباب اثر کو بچایا جائے اور انھیں متاثر کرنے کی زیادہ سے زیادہ سعی کی جائے۔

(۵) فسادات کے مطالعہ کے دوران میں ایک دلچسپ عنصر سے ہمارا تعارف ہوا ہے جو اپنی تعداد کے اعتبار سے بہت بڑا اور فسادات کے پھوٹنے اور بڑھ نکلنے میں اہم حصہ ادا کرتا ہے۔ یہ عنصر بزدل اور دوں ہمت افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ خود اس کے اندر دو صنفیں پائی جاتی ہیں، بزدل شریف اور بزدل شریر۔

اب ہوتا یوں ہے کہ جسارت رکھنے والے مفسدین تحریک کے آتے ہیں اور گڑبڑ مچانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتے ہیں، اور جری شرفا کی قلیل سی تعداد ایک حد تک اس کے آڑے آنے کی سعی کرتی ہے لیکن بیچ کا عنصر اول الذکر کے لیے مفید اور ثانی الذکر کے لیے روک ثابت ہوتا ہے۔ بزدل شریف تو شرارت کے ظہور پر دم سادھ لیتے ہیں اور فساد کو روکنے کے لیے اس سرگرمی کا دسواں حصہ بھی ان میں نہیں پایا جاتا جتنی سرگرمی شریر عنصر شرارت پھیلانے میں دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ بزدل شرفا میں سے بعض "بہادر" بزدلی کی وجہ سے زبان سے شریر عنصر کی حرکات کی تائید بھی کرلیا کرتے ہیں، لیکن بس ان کی شرافت صرف اس قدر ہوتی ہے کہ دل سے شرارتوں کو برا سمجھتے ہیں! آخرکار جب فساد پھوٹتا ہے تو پھر یہ اپنی بزدلی ہی کی وجہ سے مفسدین کے سرگرم آلۂ کار تک بن سکتے۔ دوسری طرف بزدل مفسدین کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شرارتوں کے باقاعدہ پھوٹ بہنے سے پہلے وہ کھل کر سامنے نہیں آتے

بلا بزدلی کی وجہ سے کچھ شریف سے بنے رہتے ہیں، اور موقع دیکھ کر شریفوں کی سی باتیں بھی کر لیتے ہیں لیکن وہ ایسے چاہتے ہیں کہ فساد ہونا چاہیے اور جب وہ ہو جاتا ہے تو کھل کھیلتے ہیں۔ یہ بزدل حضرات کے دو گروہ بہت ہی خطرناک اور مضر مفسد ثابت ہوتے ہیں۔

ان گروہوں کو خوب اچھی طرح پہچاننا چاہیے، اور ان کے متعلق یہ سمجھ رکھنا چاہیے کہ یہ جدھر کی ہوا چلے گی، ادھر ہی تنکوں کی طرح اڑنے لگیں گے، اور ان کو ٹھیک کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ جری مفسدین کی جسارتوں کا سدباب کر لیا جائے اور ممکن ہو تو جری شرفا کو آگے کیا جائے۔ اس امر کی گنجائش بھی ہوتی ہے کہ بزدل شرفا میں سے بعض کو جرأت دلا کر ان کے اچھے جذبات کو قوی تر کر کے انھیں فساد کی روک تھام کرنے والوں سے تعاون کر لیا جائے۔

افسوسناک یہ امر ہے کہ مفسدین میں جسور زیادہ ہوتے ہیں اور بزدل کم، لیکن شرافت کے ساتھ بزدلی کا جوڑ تو گویا ایک مستقل چیز بن کے رہ گیا ہے۔ ارباب شرارت منظم ہو کر، کھل کر، اور تیز رفتاری سے اپنا کام انجام دیتے ہیں، لیکن اکثر ارباب شرافت، دبے سکڑے، دم سادھے، گوشہ نشینی اختیار کیے، بے اتفاقی اور درماندگی میں گھرے، شیطان کی سرگرمیوں کو آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں، لیکن غیرت کا جذبہ ان کے سینوں میں کوئی کروٹ نہیں لیتا۔

(۲) بعض مقامات پر فساد کے رونما ہونے سے پہلے اور بعض جگہوں پر فساد کے پھوٹنے کے بعد امن کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں، مگر جتنی افسوسناک یہ کمیٹیاں ہیں، اتنا افسوسناک فساد کا سارا ہنگامہ بھی نہیں۔ یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ جو لوگ ان کمیٹیوں کے ارکان و عہدے دار بنے ہوئے ہیں، بالکل وہی ... صرف اپنی قوم کی فسادی سرگرمیوں میں سرگرم کار ہیں۔ ادھر آتے ہیں تو امن کے داعی بن جاتے ہیں اور شرافت، انسانیت، اخلاق اور مذہب کے نام سے اپنی تقریروں میں عوام الناس سے امن کو قائم رکھنے کی اپیلیں کرتے ہیں، لیکن جب اپنی قومی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں تو وہاں اپنے لوگوں کو قوم اور قومی سیاست کے نام پر ہنگامہ آرائی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان کمیٹیوں کے ارکان کے ایسے بہروپیے پن کا اثر یہ ہوا کہ عموماً ان کمیٹیوں کا وجود بالکل بے معنی ثابت ہوا ہے۔

پھر طرفہ ماجرا یہ کہ ان امن کمیٹیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ کارندوں کے اندر اخلاق ناپید ہے۔ ان کی زندگیوں میں بے اصولا پن حد درجہ ہے۔ ان کی روزمرہ کی سرگرمیاں اور مشاغل ان کے پیشے اور ذرائع معاش سب کے سب فتنہ انگیز اور فساد پرور ہیں لیکن وقتی طور پر امن افروزی کے اخلاقی منصب پر بھی سرفراز ہو جاتے ہیں یا سرفراز کر دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کوئی سیٹھ صاحب بلیک مارکیٹ کے بہت بڑے "گھاگ" ہوں گے۔ کوئی سب جج صاحب خوفناک قسم کے رشوت خوار ہوں گے۔ کوئی پروفیسر صاحب الحاد اور مادیت کی تعلیم دینے والے ہوں گے، کوئی فلم ڈائرکٹر صاحب انتہائی شرابی اور زانی ہوں گے، کوئی مقرر صاحب اپنی تقریروں کے ذریعے اشتعال اور منافرت کو پھیلانے کے ماہر ہوں گے، کوئی مصنف صاحب افسانوں اور نظموں سے اخلاقیات کو تباہ کرنے میں مصروف رہنے والے ہوں گے، لیکن عوام کی بدنصیبی اس قسم کے گوناگوں حضرات کو جوڑ جاڑ کے امن کمیٹی بنا دے گی۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں امن کا خدا ہی حافظ ہے۔

یہ حالت معلوم کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ رسمی امن کمیٹیاں بالکل بے کار شے ہیں اور ان پر کبھی کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ خدا ترس اور راستباز، منصف مزاج اور بااخلاق، خدمت پیشہ اور امن پسند افراد کو ہندو مسلم کی تمیز کے بغیر تلاش کیا جائے اور چاہے ان کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو، ان سے بھلائی کی امید رکھی جائے اور ان کی پوری پوری مدد کی جائے۔

(۷) اخلاق پسند لوگوں کو دل شکستہ کر دینے والی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے حالیہ فسادات میں حصہ لینے والوں کے اندر کسی نوعیت کا کیرکٹر برسر عمل نہیں رہ سکا۔ نہ مذہب کے سکھلائے ہوئے اعلیٰ اخلاق کا فی الجملہ لڑائیوں میں کوئی نشان پایا گیا ہے، نہ عام فطری اخلاقی احساسات کی کوئی رمق تازہ ہنگاموں میں برقرار رہ سکی ہے۔ ظلم و ستم کی ہر وہ شکل جو سوچی جا سکتی ہے عمل میں لائی گئی ہے۔ بچوں کا قتل، عورتوں کی ہلاکت، ان کی عصمتوں پر حملے، زندہ انسانوں کو جلا دینا، پناہ چاہنے والوں کو پناہ دینے سے انکار کر دینا، پناہ دے کر پھر شکنجۂ عقوبت میں کسنا، جبری تبدیلیٔ مذہب، جائدادوں کو لوٹنا اور جلانا، بستے اور بے بس مسافروں کی جان کے درپے ہونا، یہ سبھی کچھ ہوا ہے۔ ــــ خود انسانوں کے ہاتھوں ہوا ہے ــــ خدا کے بندوں اور آدم کے بیٹوں نے کر دکھایا ہے۔

یہ نتیجہ ہے سیاست کو مذہب کی اخلاقی روح سے محروم کر دینے کا اور یہ نتیجہ ہے خدا کے خوف کو عوام کے ذہنوں سے نکال دینے کا۔ پھر یہ نتیجہ ہے اپنی تحریکوں اور جماعتوں کو اخلاقی حدود سے آزاد چھوڑ دینے کا۔ آخر جس ملک کی تعلیم اخلاق کا جائزہ لیے بغیر سند فضیلت دیتی ہو، جس کی سیاست کسی اخلاقی ضابطہ کے بغیر جماعت بندیاں کرتی ہو اور کسی اخلاقی معیار کو سامنے رکھے بغیر عوام کے لیے لیڈر منتخب کرتی ہو، جس کا سماج ذلیل سے ذلیل کیرکٹر کے لوگوں کو اونچے سے اونچے منصب پر لا بٹھاتا ہو، اس کے عوام سے اشتعال کی حالت میں آپ کیسے اخلاق کا مطالبہ کر سکتے ہیں؟

پھر عوام کا اشتعال بھی کوئی معمولی اشتعال نہیں، بلکہ نیشنلزم کا دلایا ہوا خوفناک اشتعال ہے۔ ہندوستان میں ایک نیشنلزم کی جگہ دو نیشنلزم بیک دفعہ ابھر آئے ہیں اور دو نیشنلزم جب آپس میں ٹکرا رہے ہوں، تو ان کی فطرت کسی اخلاق کو گوارا نہیں کر سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مقامات پر فتنے برپا ہو جانے کے بعد عوام میں کوئی اخلاقی انضباط ان کے مقامی اکابر برقرار نہیں رکھ سکے اور نہ ملک کے اونچے لیڈروں کی اخلاقی اپیلیں سودمند ثابت ہوتی ہیں۔ بلکہ ہر دو فریق نے انتہائی بربریت ہی کو اعلیٰ ترین اخلاق سمجھا ہے۔

اب اگر کچھ لوگ فی الواقع اس زوال اخلاق کی تلافی کرنا چاہتے ہوں تو ان کی سرگرمیوں کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو پھر خدا کے نور سے منور کریں، ان کو لادین سیاست سے ہٹا کر دیندار سیاست کی طرف لائیں اور انھیں قوم پرستی کے بجائے انسانیت کی محبت سے بہرہ ور کریں۔ نیز یہ ضروری ہے کہ ملک کو مادی مقاصد کی جگہ اخلاقی مقاصد کے لیے جدوجہد کرنا سکھایا جائے، جماعت بندیاں اخلاقی ضابطہ کے ساتھ ہوں، تحریکیں اعلیٰ اخلاق کے خطوط پر چلیں، لیڈرشپ کے لیے اعلیٰ کیرکٹر کے لوگوں کو منتخب کیا جائے اور حکومت اور سماج کے نظام کو خدا کا تابع اور اخلاق کا پابند بنانے کے لیے پوری قربانیوں کے ساتھ جدوجہد شروع ہو۔ ورنہ امن کی ساری اور بڑی کوششیں بیکار ہیں۔

(۸) ورندگی کے مختلف حالیہ ہنگاموں میں ہر جگہ اکا دکا آدمی ایسے ضرور پائے گئے ہیں، جنھوں نے اپنی انسانی ذمہ داریوں کو کسی نہ کسی حد تک پورا کرنے کی سعی کی ہے اور ظالموں کو ظلم سے

روکنے یا مظلوموں کو ظلم سے بچانے کے لیے اپنے آرام اور مال کی قربانیاں دی ہیں، بلکہ بعض اوقات اپنی جان کو بھی خطرہ میں ڈالا ہے۔ کئی مسلمان تھے جو مصیبت زدہ غیرمسلموں کو بچانے کے لیے مسلمانوں کے سامنے کھڑے ہو گئے، اور اسی طرح کئی غیرمسلم تھے جو مسلمان مظلوموں کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ لیکن افسوس کہ اس قسم کے لوگوں کی تعداد حد درجہ کم ہے اور خطرہ ہے کہ اگر ملک کی مجموعی فضا کو نہ بدلا گیا تو انسانیت کے ناموس کو بچانے والے یہ چند افراد بھی نیشنلزم کے سیلاب میں بہ جائیں گے۔

(۹) عجیب مصیبت ہے کہ دونوں طرف کے لکھے پڑھے افراد تک فسادات کی ساری ذمہ داری ابھی انگریز اور انگریزی حکومت کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس غلط فکری کی وجہ سے نہ ان کی نگاہیں اپنی غلط کاریوں کی طرف جاتی ہیں، نہ اصلاح احوال کی کوئی کوشش یہ شروع کرتے ہیں مانا کہ انگریز ایک حد تک آپ لوگوں کو لڑانے کا موجب بن رہا ہے مگر سوال یہ ہے کہ آپ جانتے بوجھتے لڑتے کیوں ہیں؟ کیا اس میں آپ کا کچھ بھی قصور نہیں؟ آپ میں سوچنے کی قوت نہیں؟ آپ کو اپنے نفع نقصان کا شعور نہیں؟ آپ اپنے اعمال میں بالکل غیر مختار ہیں؟ اپنی غلطیوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنا غلطیوں کے خوب پھلنے پھولنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر یہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنے کی کوشش کب تک جاری رہے گی۔

دراصل وجوہ فساد پر توجہ دلاتے ہی یہ لوگ ایسی کوئی بات کہہ کے سلسلۂ گفتگو روک دیتے ہیں تاکہ ان کے دل کا چور نہ پکڑا جائے۔ لیکن فی الواقع اس چور کو پکڑنا شدید ضروری ہے۔ دو قومیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں اور جب انھیں اس سے روکا جاتا ہے تو وہ کہہ دیتی ہیں کہ ہم کیا کریں، ہمیں تو انگریز لڑا رہا ہے! یہ آخر کوئی معقول عذر ہو سکتا ہے؟ اس عذر کا سکہ اب سیاست کی منڈی میں کھوٹا ہو چکا ہے، اب تو کوئی کھرا سکہ چلنا چاہیے۔

(۱۰) امن کے بچاؤ یا امن کی بحالی کا کام کرنے والے لوگوں کو فساد زدہ یا مشتعل مقامات پر ایک بڑی دقت یہ پیش آتی ہے کہ ان کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلائی جاتی ہیں اور کچھ تو

خوف زدہ عوام یوں بھی شکی ہو جاتے ہیں اور کچھ یہ بات بھی ہوتی ہے کہ غیر دیانتدار لوگوں سے انھیں تلخ تجربات ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ امن کے ہر پیغام کو بے اعتمادی کے ساتھ سنتے ہیں اس پر مستزاد یہ کہ مفسدین خاص طور پر اس امر کا اہتمام کرتے ہیں کہ مساعی امن کو شکست دی جائے اور اس غرض کے لیے وہ کارکنوں کے متعلق شکوک و شبہات پھیلاتے ہیں۔ مگر اس مشکل کے باوجود ہمارے کارکنوں کے تجربات کا حاصل یہ ہے کہ دیانتداری اور اخلاص اور اخلاق کے ساتھ کام کرنے میں یہ رکاوٹیں زیادہ دیر تک حائل نہیں رہ سکتیں اور جوں جوں قدم آگے بڑھتا ہے، راستے صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

انسانی فطرت کو صحیح طریق سے اپیل کیا جائے تو وہ تعصبات اور جانبدارانہ رجحانات اور انتقامی جذبات کے پردے پھاڑ کر اس پر لبیک کہتی ہے ــــ کبھی جلدی اور کبھی ذرا دیر میں! اس فطرت کو کسی بھی مسلمان اور کسی بھی غیر مسلم بھائی کے اندر ابھار کر اگر بات کیجیے تو وہ حق اور راستی اور انصاف کے اصولوں کو فوراً اپنانے لگتا ہے اور خود اپنی قوم اور اپنے لیڈروں اور اپنے اخبارات اور اپنی سیاسی جماعتوں کی ناراستیوں اور ناانصافیوں کو پوری فراخ دلی سے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، اور اس کے اندر ظلم کے خلاف ایک نفرت اور احسان کے لیے ایک خفیف سا ولولہ کروٹیں لینے لگتا ہے۔ باہر کے مصنوعی انسان کو اپنے راستے سے ہٹا کر اگر آپ اندر کے حقیقی انسان کو مخاطب کریں تو وہ امن اور اخلاق کی دعوت کو سننے لگا۔ لیکن اگر آپ باہر کے مصنوعی انسان سے الجھ گئے تو پھر اس کے تعصبات اور قوم پرستانہ جذبات آپ کی دعوت کو ضمیر کی گہرائیوں میں ہرگز نہ اترنے دیں گے۔

پس دوسرے کی انسانیت کو پکارنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ خود داعی کے اندر سے صرف حقیقی انسانیت بول رہی ہو، راستی اور انصاف کا خالص پیغام ابل رہا ہو، خدا پرستی اور اخلاق کی بے آمیز پکار بلند ہو رہی ہو۔ ایسے پیغام اور ایسی پکار کے راستے میں شکوک اور بدگمانیاں اور تعصبات زیادہ دیر تک حائل نہیں رہ سکتے۔

(۱۱) ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ فسادات صریحاً قوم پرستانہ سیاست کے پیدا کردہ ہیں،

لیکن دوران فساد میں فریقین کی اقتصادی کشمکش بھی مؤثر رہی ہے۔ بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جب مظلومین کو بچانے کی کوشش کی گئی تو بلوائیوں نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا کہ یہ تو وہی ہیں جو دو پیسے کی دیا سلائی چار چار آنے میں دیتے تھے اور یہ وہی ہیں جو دس دس روپے پر سو سو لگا کر ہم سے تین تین سو اور پانچ پانچ سو وصول کرتے رہے ہیں۔ اس کے بالمقابل کہیں کہیں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جہاں کسی شخص کو محض اس بنا پر مظالم سے بچا لیا گیا کہ اس نے اپنے کاروبار کے ذریعے عوام کی خدمت انجام دی ہے اور انہیں نفع کے لیے دکھ نہیں دیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فریقین میں حسن معاملت اور خدمت و احسان کا مسلک رائج ہو تو فسادات کی روک تھام میں یہ چیز ممد ہو سکتی ہے۔

قواعد ایجنسی

وہ حضرات جو پہلے سے رسالہ ترجمان القرآن کے ایجنٹ ہیں یا اب ایجنسی لینا چاہتے ہیں، ان کے لیے قواعد ذیل کی پابندی ضروری ہے۔

۱۔ پانچ پرچوں سے کم خریداری پر ایجنسی نہیں دی جاتی۔

۲۔ کمیشن کی شرح ۲۵ فیصد بالکل قطعی ہے۔

۳۔ ایجنسی کے سلسلہ کے پرچے بک پوسٹ یا رجسٹرڈ روانہ نہیں کیے جا سکتے، بلکہ کمیشن منہا کر کے بقیہ رقم کا وی پی کیا جائے گا تاکہ حساب صاف رہے۔

۴۔ محصول ڈاک میں سے ۲ر فی پیکٹ ایجنٹ کے ذمہ ہوگا۔ بقیہ دفتر خود برداشت کرے گا۔

۵۔ مطلوبہ پرچوں کی تعداد میں کمی بیشی کی اطلاع ہر مہینہ کے پہلے ہفتہ میں پہنچ جانی چاہیے۔

"منیجر"

رسائل و مسائل

مسلمانوں کے گذشتہ کارناموں پر لٹریچر کی ضرورت

سوال:۔ یہاں یورپ کی فضا میں رہتے ہوئے میں اس امر کی شدید ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ ملت اسلام کے گذشتہ اعلیٰ کارناموں کی تحقیق کرکے انھیں سائنٹفک طرز پر پیش کیا جائے۔ ایسی چیزیں پڑھ کر ذہین لوگ بہت اچھا اثر لیتے ہیں۔ کیا آپ انگریزی اردو کی ایسی اچھی اچھی کتابوں کا پتہ دے سکتے ہیں، جنھیں یہاں استعمال کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر میرے سامنے ایک کتاب Lagacy of islam ہے۔ میں نے اسے پسند کیا ہے، آپ نے اگر اسے دیکھا ہو تو اس کے متعلق رائے دیجیے:

جواب:۔ جس قسم کا مواد آپ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے گذشتہ کارناموں کے متعلق پیش کیا جائے وہ انگریزی میں تو صرف دو چار کتابوں میں جمع کیا گیا ہے، لیکن اردو اور عربی میں بکثرت کتابیں اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔ مصر و شام کے متعدد اہل قلم اور ہندوستان میں مولانا شبلی اور ان کے مکتب خیال کے لوگوں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔

Lagacy of islam میں جو کچھ لکھا ہے وہ اصل تصویر کو بہت کچھ گھٹا کر اور بگاڑ کر پیش کرتا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ لفظ Lagacy تو نہایت ہی Mis-leading ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام ایک گذری ہوئی چیز کا نام ہے جو حال پر اپنے کچھ نقوش چھوڑ گئی ہے۔ لیکن ہم اسلام کو صرف ماضی ہی کی نہیں، بلکہ حال کی اور اس سے بڑھ کر مستقبل کی چیز سمجھتے ہیں اور اس دعویٰ کو ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

غیر مسلموں میں تبلیغ اسلام

سوال: میرے ایک آزاد خیال ہندو دوست جو اسلام کی تعلیمات سے کسی قدر متاثر ہیں، یہ کہتے ہیں کہ ہندو چونکہ کوئی مکمل نظام زندگی نہیں ہے، اس وجہ سے دورِ حاضر میں اس سے وابستہ رہنا سنجیدہ اور ذہین ہندو طبقہ کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ پس ہندوستان میں اسلام کے از سر نو فروغ پانے کا موقع موجود ہے۔ اگر وہاں اسلام کا نام لیے بغیر اسلام کے اصول و ضوابط کو پھیلانے کی کوشش کی جائے تو بہت سے ہندو اسے قبول کر سکیں گے۔ لیکن اسلام کے نام سے ہندو سوسائٹی میں جو چڑ پیدا ہو گئی ہے، اس کی وجہ سے کھلم کھلا نظام اسلامی کا پرچار کرنا سود مند نہیں رہا۔ میں بھی اپنے دوست کے اس خیال سے ایک حد تک متفق ہوں۔ کیا آپ اس طریق تبلیغ کو اختیار کر سکتے ہیں، یا اس کا کوئی تجربہ کیا جا چکا ہے؟

جواب: آپ کے ہندو دوست نے اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں جو مشورہ دیا ہے وہ پہلے سے ہمارے پیش نظر ہے اور بعض مواقع پر ضرورۃً ہم اس پر عمل بھی کرتے ہیں، لیکن معمولاً اسلام کی تبلیغ کا یہ طریقہ کچھ زیادہ کارگر نہیں ہے۔ صحیح طریقہ وہی راست (Straignt forword) طریقہ ہے جس میں اسلام کو اسلام کے نام ہی سے کھلم کھلا پیش کیا جائے۔ اس کی کامیابی میں جو مشکلات نظر آتی ہیں وہ صرف اس وقت تک ہیں جب تک زبان سے تو مسلمانوں کی دعوت اسلام کی طرف ہو لیکن عمل سے وہ شہادت کفر کی دے رہے ہوں۔ یہ خرابی اگر دور ہو جائے اور ہماری اپنی زندگیاں اس حق کی شہادت دینے لگیں جس کی دعوت ہم زبان سے دیتے ہیں تو غیر مسلم انسان زیادہ مدت تک اپنے تعصبات پر جمے نہ رہ سکیں گے اور Vested intrests رکھنے والے خود غرض لوگوں کے سوا صاف ستھری فطرت کے لوگ اس پر ایمان لاتے چلے جائیں گے۔

اسلامی ریاست میں ٹیکس

سوال: کیا اسلامی ریاست علاوہ زکوٰۃ عشر وغیرہ کے موجودہ گورنمنٹوں کی طرح از خود مالیہ کی

مرضی کے بغیر ٹیکس لگا سکتی ہے؟ ورنہ یہ بتایا جائے کہ وہ گوناگوں اخراجات کو کیسے پورا کرے گی؟

جواب:- یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ اسلامی ریاست کی "منصوص" آمدنیاں اس کے جملہ اخراجات کو پورا کر سکیں، کیونکہ زکوٰۃ، عشر، صدقات وغیرہ کی بڑی بڑی رقوم کے مصارف متعین و منصوص ہیں اور اسلامی ریاست کی آمدنیاں دے سکنے والے محکمے خرچ کرنے والے محکموں سے کم ہیں۔ پس یہ بات ناگزیر ہے کہ دوسرے مناسب طریقوں سے مصارف کو پورا کیا جائے۔ ان طریقوں میں سے ایک تو چندہ کا طریقہ ہے اور دوسرا ٹیکس کا۔

آجکل کے مالیات کے بجٹ جس صحت کے ساتھ سال کے شروع میں بنانے ضروری ہو گئے ہیں اور زندگی، معاشی، تعلیمی اور رفاہ عامہ کے مختلف امور میں منصوبہ بندی کی جو اہمیت پیدا ہو گئی ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرون اولیٰ کا چندہ سسٹم[1] پوری طرح کارگر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ بعض امور کے لیے چندہ کا طریقہ اختیار کیا جائے مگر ریاست کے تمام معاملات میں یہ صورت موزوں نہیں ہو سکتی۔

اگر ملک گیر معاملات میں چندہ سسٹم کو اختیار کیا جائے تو اس کا طریق بھی یہ ہوگا کہ ریاست مطلوبہ رقم کی مقدار کو معین کر کے مختلف علاقوں یا شہروں اور بستیوں کا حصہ مقرر کر دے کہ کس جگہ سے کتنی رقم آنی چاہیے۔ پھر وہاں کے مقامی منتظمین ایک نظم کے ساتھ جو مقامی لوگوں کے مشورے سے طے ہوگا اس متعین رقم کو فراہم کریں گے۔ جو شخص جس حیثیت کا مالک ہوگا، اسی کے مطابق وہ اس میں حصہ لے گا اور جو لوگ معذور ہوں گے وہ مستثنیٰ رہیں گے۔

علاوہ بریں جو ٹیکس امیر اور اس کی مجلس شوریٰ بطور خود لگاتا ہے، ان کے متعلق یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ وہ گویا رعایا کی مرضی کے بغیر عائد کیے گئے ہیں۔ بخلاف اس کے صورت واقعہ یہ ہوگی کہ امیر کی ذات اور اس کی مجلس شوریٰ عین رعایا ہی کی مرضی کی نمائندگی اور وکالت کرنے والی ہے اور وہ جس طرح رعایا کی ساری اجتماعی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے رعایا کی وکیل ہے، اسی طرح ان کے جملہ مصارف کو فراہم کرنے میں بھی وہ رعایا کی وکیل ہے۔ پس اگر وہ ٹیکس عائد کرے تو یہ گویا خود رعایا ہی کا اپنے اوپر ٹیکس عائد کرنا ہوگا۔

---

[1] دور نبوی و خلافت راشدہ میں موقع جنگ پر جو مصارف سامنے آجاتے تھے ان کو پورا کرنے کے لیے مسلم سوسائٹی سے عام اپیل کر دی جاتی تھی۔

مطبوعات

حکومت الٰہیہ :- مترجمہ رئیس احمد صاحب جعفری۔ شائع کردہ :- نفیس اکیڈمی عابد روڈ، حیدر آباد دکن۔ قیمت مجلد مع گردپوش ۲ روپے ۸ آنے۔

یہ ترجمہ ہے جناب عبدالوہاب مصری کی کتاب "السیاستہ الشرعیہ" کا۔ اس میں اسلام کے نظام سیاسی کے اہم گوشوں پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور متعدد نازک اختلافی مسائل کو چھیڑ کر سرسری بحث پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔ یہ صورت اوسط درجہ کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے مفید نہیں ہو سکتی۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ مصر کی مغرب زدہ فضا میں اسلامیات پر جو لٹریچر تیار ہوا ہے اس میں اسلام اور وقت کے رجحانات میں مصالحت کرانے کے لیے جو مواد بھرا جاتا رہا ہے، اس سے یہ کتاب بھی "محروم" نہیں رہی۔ البتہ اس کو نسبتاً کچھ کم حصہ ملا ہے۔

رسالہ الحسنات : زیر ادارت جناب ابو سلیم محمد عبد الحی صاحب۔ مقام اشاعت : دفتر رسالہ الحسنات رام پور (ریاست) یوپی۔ چندہ سالانہ ۳ روپے ۸ آنے۔

یہ رسالہ مسلمان عورتوں، لڑکیوں اور لڑکوں کو صالح ذہنی غذا مہیا کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے اور ایک مسلمان نے یہ جرأت کی ہے کہ اس فضا و اسلام ناشناس میں خالص اسلامی فکر و اخلاق کو نشر کرے۔

۴۴ صفحے کے پرچے میں آپ کو صرف یہی نہیں کہ عقائد اسلامی اور فلسفۂ قرآنی کے جواہر ریزے آسان زبان اور دلکش پیرائے میں ملیں گے۔ بلکہ اس کے ساتھ جدید تمدنی معلومات کا ایک ذخیرہ بھی آپ کو ہر مہینے حاصل ہو سکے گا۔

آسان زبان میں لکھنا خود ایک مشکل کام ہے اور پھر عورتوں، اور بچوں کے لیے لکھنا تو اور بھی

نازک فن ہے، اس کے لیے زبان پر ماہرانہ قدرت، نفسیات کا وسیع علم اور فن تعلیم سے ایک گونہ واقفیت ضروری ہے۔ جناب مدیر نے بہت ہی نازک ذمہ داری کو محض اپنے خلوص کے بل پر سنبھالا ہے۔ اور اسے پورا کرنے کے لیے انھیں ابھی بہت زیادہ محنت کرنا پڑے گی۔ لیکن ایک کوشش کی ابتدا میں جو کمزوریاں ہوتی ہیں وہ آگے بڑھنے سے گھٹتی جاتی ہیں۔ الحسنات کے تین پرچوں میں جو رفتار ارتقا پائی جاتی ہے، وہ اگر قائم رہی تو شاید یہ پرچہ عورتوں اور بچوں کے کم خواندہ حلقہ کے لیے ایک نعمت بن کے رہے گا۔

خریداران ترجمان القرآن سے التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھیے۔ (خصوصاً ڈاکخانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے)۔ سابق نمبر خریداری بھی تحریر فرمائیے۔

۲۔ وقتی طور پر اگر ایک دو ماہ کے لیے پتہ تبدیل کرانا ہو تو براہ کرم اپنے ڈاکخانہ کو نئے عارضی پتہ پر پرچہ Re-direct کرنے کی ہدایت کر دیا کیجیے اور مستقل طور پر پتہ بدلنا ہو تو رسالہ کے دفتر کو لکھیے۔ ورنہ بار بار اندراجات کو بدلنے سے دفتر باقاعدگی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ نیز تبدیلیٔ پتہ کی فرمائش ۱۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیے جس میں پہلا پتہ اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالے کے ساتھ درج ہوں۔

۳۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجیے یا وی پی کی اجازت دیجیے۔ قرض یا وعدے پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا ہے۔

۴۔ رسالہ ترجمان القرآن کے معاملات میں مرکز جماعت اسلامی کے کسی دوسرے شعبے کو مخاطب نہ کیجیے اور نہ دوسرے شعبوں سے متعلقہ امور ہمارے دفتر کے معاملات میں خلط ملط کر کے لکھیے اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظر انداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

"منیجر"

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۵/-/-
رسالہ دینیات	۱/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-
مسئلہ جبر وقدر	۱/-/-
تجدید و احیائے دین	۱/-/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۲/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۲/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-
پردہ	۲/۸/-
تنقیحات	۲/۸/-
خطبات	۲/۲/-
تفہیمات	۳/۸/-
حقیقت توحید	۱/۲/-
اسلام اور ضبط ولادت	-/۱۲/-
ہیگل مارکس اور نظام اسلام	۲/۸/-
رسالہ دینیات (انگریزی)	۳/۸/-
اسلام کیا ہے (انگریزی)	۱/۸/-
ایمان کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
سلامتی کا راستہ	-/۶/-
اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۶/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	-/۶/-
انسان کا معاشی مسئلہ	-/۶/-
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	-/۶/-
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
دین حق	-/۶/-
اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
ایک اہم استفتا	-/۲/-
دستور جماعت اسلامی	-/۲/-
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	-/۱۰/-
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۹/-
روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۱/-/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

مطبوعہ رہبر پریس، لاہور